یکم اکتوبر ۲۰۲۶ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۹ ۔ شمارہ نمبر: ۱۹

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE
مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفرخان، محمودالحق صدیقی، نویدنون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی
ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۹۲_۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہوسکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

نئی، لامتناہی جنگ

علی واعظ

امریکا اور ایران کے درمیان جنگ جاری ہے۔ کسی کی بھی حتمی فتح کے آثار نہیں۔ تو پھر لڑائی کیوں رُکنے کا نام نہیں لے رہی۔

امریکا ایران جنگ کب ختم ہوگی؟ امریکی حکام کا دعویٰ ہے کہ اِس کا جواب جلد سامنے آنے والا ہے۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ستمبر میں اعلان کیا ''میرے خیال میں جنگ نومبر کے انتخابات کے فوراً بعد ختم ہو جائے گی۔ وہ مزید نہیں ٹِک سکتے۔'' ایرانی رہنما بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ جنگ کا اختتام قریب ہے۔ پاسدارانِ انقلاب کے کمانڈر احمد وحیدی نے اگست میں دعویٰ کیا کہ تہران نے تاریخ کی سب سے مسلح فوج کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا ہے۔ بہت سے تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ یہ تنازع مزید طُول پکڑے گا اور کسی کی واضح فتح کے بغیر مذاکرات پر ختم ہوگا۔

عام خیال یہ ہے کہ جنگ زیادہ طُول نہیں پکڑے گی۔ تمام جنگیں بالآخر ختم ہوتی ہیں اور توانائی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے بعد دنیا خصوصاً اِس جنگ کے رُکنے کی منتظر ہے۔ پریشان کن حقیقت یہ ہے کہ یہ تنازع ابھی ختم ہونے کے قریب نہیں۔ جنگ کے دو اہم فریق اپنے اہداف حاصل نہیں کرسکتے پھر بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اِتنا کچھ حاصل کررہے ہیں جس سے فوجی اور اقتصادی وسائل کے امتزاج کے ذریعے لڑائی جاری رکھنا ناممکن ہے۔ امریکا ایرانی حکومت کا تختہ نہیں الٹ سکتا، اُسے میزائل اور ایٹمی پروگرام سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کرسکتا اور اُسے اپنے علاقائی اتحادیوں کی حمایت سے باز بھی نہیں رکھ سکتا لیکن ایران کی فوج اور معیشت کو محدود تو رکھ ہی سکتا ہے۔ ایران دنیا کی واحد سپر پاور کو مشرقِ وسطیٰ سے نکال نہیں سکتا مگر وہ امریکی علاقائی فوجی اڈّوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے، اُن پر بمباری کرسکتا ہے اور بین الاقوامی تجارت میں خلل ڈال سکتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ دونوں ممالک کے پاس غیر معینہ مدت تک لڑنے کے لیے ضروری وسائل موجود ہیں اور دونوں سمجھتے ہیں کہ اُن کے پاس اِن وسائل کے استعمال کے سوا چارہ نہیں۔ دونوں مذاکرات بھی کرتے ہیں مگر اعتماد کا شدید فقدان ہے۔ وہ شبہات کا شکار رہتے ہیں کہ دشمن کسی بھی نوع کی جنگ بندی کو دوبارہ حملہ کرنے سے پہلے صف بندی اور رسد کی بحالی کے لیے استعمال کرے گا۔ ایران کو یہ تشویش ہے کہ امریکا اُسے میزائل اور ایٹمی پروگرام کے حوالے سے شدید دباؤ میں لے سکتا ہے۔ واشنگٹن کو یہ تشویش لاحق ہے کہ پابندیوں میں بڑی نرمی اُسے وہ وسائل اور وقت فراہم کرے گی جس کی اسے اپنی صلاحیتوں کی بحالی کے لیے ضرورت ہے۔

اسرائیل کو یہ تشویش لاحق ہے کہ اگر اُس نے ایران کے معاملے میں ضبط و تحمل سے کام لیا تو وہ مزید طاقتور بن کر ابھرے گا۔

یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ جنگ اُسی طرح جاری رہے گی جس طرح یہ جاری ہے۔ جنگ کا کوئی واضح نتیجہ نکلے گا نہ کوئی جامع معاہدہ ہی ہوگا۔ معاملات کا جوں کا توں رہنا چونکہ دونوں فریقوں کے لیے قابلِ قبول ہے اور کسی بھی فریق کے پاس برتری حاصل کرنے کی طاقت نہیں ہے اِس لیے کوئی بڑا، ڈرامائی تصادم بھی نہیں ہوگا۔ تہران شکست کھائے گا نہ واشنگٹن۔ مگر خیر، فتح بھی کسی کی نہیں ہوگی۔

کوئی راستہ نہیں

امریکا سمجھ رہا تھا کہ وہ بہت جلد ایران کو زیر کرلے گا۔ یہ سوچ اس لیے تھی کہ جون ۲۰۲۵ء میں امریکا اور اسرائیل نے ایران کی بیشتر ایٹمی تنصیبات تباہ کردی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ بہت سی میزائل سائٹس کو بھی اُڑا دیا تھا۔ اسرائیل نے درجنوں سینئر ایرانی سائنس دانوں اور دو درجن سے زائد فوجی حکام کو ہلاک کیا تھا۔ لبنان میں حزب اللہ کو بھی تباہ کردیا گیا۔ شام کے صدر بشارالاسد کا طویل اقتدار بھی ختم کردیا گیا۔ وسیع پیمانے پر ہونے والے مظاہروں نے ایرانی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ امریکی فوج اور اسرائیل ڈیفنس فورسز کو ایرانی فضائی حدود تک بظاہر بلا روک ٹوک رسائی حاصل تھی۔ دوسرے لفظوں میں، حکومت تباہی کے دہانے پر دکھائی دیتی تھی۔

تنازع کے ابتدائی دنوں میں، اسرائیل اور امریکا نے ایرانی سپریم لیڈر علی خامنہ ای اور ملک کے کئی اعلیٰ فوجی کمانڈروں کو ہلاک کردیا۔ ایران کسی نہ کسی طور سنبھل گیا۔ نئی بھرتیاں ہوئیں، نئی تعیناتیاں کی گئیں اور دشمنوں پر جوابی حملے

اندرونی صفحات پر

- بھارت میں انتخابی فہرستوں کی ''تطہیر''
- نئے سیکرٹری جنرل کا قضیہ
- جنگ سے انکار لازم ٹھہرا
- اب پیوٹن کیا کریں گے؟
- زوال پذیر مغرب
- برکس کی کہانی

شروع کر دیے گئے۔ خلیجِ فارس میں بکھرے ہوئے اڈوں پر امریکی جیٹ طیاروں، میزائل لانچرز اور ریڈار سسٹمز کو اڑا دیا گیا۔ ایران نے آبنائے ہُرمز کا کنٹرول سنبھال لیا اور اس آبی گزرگاہ کے ذریعے تجارتی آمدورفت محدود کر دی۔ ایرانی افواج نے خلیجی خطے میں شہری انفرا اسٹرکچر پر حملے کیے یعنی واشنگٹن کے علاقائی اتحادیوں کو امریکی و اسرائیلی حملے میں سہولت کاری کی قیمت چکانی پڑی۔

امریکی حکام کا دعویٰ ہے کہ رعایت دینے پر مجبور ہونے سے پہلے ایران صرف ایک بڑے حملے کی دُوری پر ہے۔ ویسے اِس بات کا امکان کم ہی ہے کہ اسرائیل اور واشنگٹن مل کر تہران کو کسی اہم معاملے پر سمجھوتا کرنے پر مجبور کر سکیں گے۔ ایران کو عسکری طور پر ختم کرنے کی کوششیں ناکام رہی ہیں۔

اب امریکا نے ایران کے جنوبی ساحل کی ناکہ بندی اور وقتاً فوقتاً بمباری کے ساتھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ اِن اقدامات نے عالمی منڈیوں تک ایران کی رسائی کو مزید محدود کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ایران اپنا تیل فروخت کرنے میں مزید مشکلات محسوس کر رہا ہے۔ زمینی راستے اور بحیرۂ قزوین (Caspian Sea) ایران کو مکمل طور پر سیل کرنے کی کسی بھی کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ چین اور روس نے ایران کو مختلف اشیا اور قیمتی خفیہ معلومات فراہم کی ہیں۔ امریکی پابندیوں کے معاشی اثرات حقیقی ہیں لیکن ایرانی حکومت بیرونی دشمنوں اور اندرونی مخالفت کے خلاف دفاع کے لیے فوجی اور سکیورٹی خدمات پر اخراجات کم کرنے کے بجائے سبسڈیز میں کمی کر کے اِس کا نقصان اپنے عوام پر ڈالے گی۔ عوام کو گِرتی ہوئی کرنسی اور بے قابو مہنگائی کا براہِ راست مقابلہ کرنا ہوگا۔ جو چیز ایرانی معاشرے کے لیے ناپائیدار ہوسکتی ہے، وہ ریاست کے لیے مکمل طور پر قابلِ برداشت ہوسکتی ہے۔ ایرانی حکومت کو معیشت کے تحفظ کی زیادہ فکر لاحق نہیں۔ وہ تو بس اُن اداروں اور حلقوں کو بچانا چاہتی ہے جو اُس کی بقا کے لیے لازم ہیں۔

امریکی حکام امید کر سکتے ہیں کہ جیسے جیسے ایران کی آبادی غریب ہوتی جائے گی، تہران کا ذہن بدل جائے گا لیکن ایرانی رہنما سمجھتے ہیں کہ وہ بقا کے چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں۔ ایرانی قیادت یہ تاثر دیتی رہتی ہے کہ کوئی بھی چیلنج اُس کے لیے چیلنج نہیں اور یہ کہ وہ اِس سے بھی بڑے چیلنجوں کا سامنا کر چکی ہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک ایران نے عراق کے خلاف جنگ لڑی جس میں لاکھوں ہلاکتیں ہوئیں اور ریاست کو اربوں ڈالر کا نقصان ہوا لیکن تہران کو جھکنے پر مجبور کرنے کے لیے اِتنا بھی کافی نہ تھا۔ ایران نے عراقی افواج کو اپنی سرزمین سے نکال باہر کرنے کے بعد بھی عراقی صدر صدام حسین کا تختہ الٹنے کی کوشش میں ۶ سال صرف کیے۔

ایسا نہیں ہے کہ امریکا نے ایران کے خلاف اپنے تمام آپشنز استعمال کر لیے ہیں۔ وہ زمینی فوج بھی ایران میں اتار سکتا ہے۔ ہاں، اس طرح کی کارروائیاں زیادہ امریکی جانی نقصان اور توانائی کے شدید تر بحران کی صورت میں برآمد ہوگا۔ امریکی فضائیہ ایران میں اہم بنیادی ڈھانچے کو مزید نشانہ بنا سکتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں ایران کے انرجی نیٹ ورک، نقل و حمل، مواصلاتی نظام اور دیگر تنصیبات کو نسل در نسل نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ایران کی جوابی کارروائیوں سے بھی خطے میں مزید خرابیاں پیدا ہوں گی۔

ایران کی حکومت نے امریکی حملوں کے سامنے مزاحمت کا جشن منایا ہے لیکن امریکا کو شکست دینے کا امکان اب بھی معدوم ہے۔ ایرانی قیادت یہ سمجھتی ہے کہ وہ طویل مدت تک امریکا سے مخاصمت کی متحمل ہوسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حتمی تجزیے میں یہ سب کچھ کِسے جھیلنا ہوگا۔ معاشی تباہی کے نتیجے میں سب سے زیادہ منفی اثرات کا سامنا تو بالآخر عوام ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ ایرانی قیادت کے پاس یہ سمجھنے کی گنجائش بہت کم ہے کہ کوئی بڑا ڈرامائی تصادم واشنگٹن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دے گا۔ امریکی صدر جذباتی بیانات دیتے ہیں مگر ایرانی قیادت کی خوش فہمی بھی جذباتی نوعیت ہی کی ثابت ہوسکتی ہے۔

اگر تہران امریکی فوجی اڈوں پر حملے بڑھا دے تب بھی فتح کا امکان نہیں۔ ایران تھوڑی کوشش سے مشرقِ وسطیٰ میں امریکی اثر و رسوخ کم یا کمزور کر سکتا ہے۔ امریکا پر بھی جنگ جاری رکھنے کے اخراجات کا بوجھ بڑھ رہا ہے۔ اب تک وہ ۴۰/ارب ڈالر کے پھیر میں آچکا ہے۔ امریکا کے پاس اب بھی بم اور میزائل بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ امریکا کا جانی نقصان بھی ہوا ہے تاہم یہ نقصان افغانستان اور عراق میں ہونے والی امریکی فوج کے جانی نقصان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ زمینی جنگ نہ لڑنے کی صورت میں امریکا کے لیے زیادہ مشکلات پیدا نہیں ہوں گی۔

توازن کی آبنائے

یہ بات پہلی نظر میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہے کہ امریکا اور ایران میں سے کوئی بھی فاتح نہیں ہوسکتا۔ جب فریقین کو اندازہ ہوجائے کہ حتمی فتح کسی کی نہیں ہوسکتی تو وہ سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ امریکا اور ایران کے ثانوی اہداف بھی ہیں۔ لڑائی کسی نہ کسی طور جاری رکھنے کی صورت میں وہ اپنے ثانوی اہداف حاصل کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوں گے۔ امریکا چاہتا ہے کہ ایران پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے حملے ہوتے رہیں تاکہ وہ اپنی فوج کو مضبوط نہ کر سکے۔ اُسے ایٹمی ہتھیار تیار کرنے سے روکنے کے لیے بھی ایسا کرنا لازم ہے۔

ایران چاہتا ہے کہ ایٹمی پروگرام کو ردِ جارحیت (deterrence) کے طور پر جاری رکھے۔ یہ ڈیٹرنس اُس کے لیے زیادہ کام نہیں۔ اُس نے خطے میں اپنے ہم خیال گروپس یا پراکسیز (عراقی ملیشیا، حوثی باغی وغیرہ) کو متحرک رکھا ہے۔ اِن پراکسیز کے ذریعے پہلے بھی ایرانی قیادت بہت کچھ حاصل کرتی رہی ہے۔ جولائی میں اُس نے اردن میں ایک اڈے پر میزائل حملہ کیا جہاں امریکی فوجی اہلکار موجود تھے حالانکہ اس سے پہلے وہاں کوئی ایرانی حملہ نہیں ہوا تھا۔

اب آبنائے ہرمز کی بندش کو بھی ایران اپنے لیے بہترین ڈیٹرنٹ کے طور پر بروئے کار لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یمن کے حوثی باغیوں کے ذریعے باب المندب کے بحری راستے کی بندش بھی اِسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ایران سمجھتا تھا کہ آبنائے ہرمز وہ ہتھیار ہے جسے آخری حربے کے طور پر بروئے کار لانا تھا۔ ایران نے ڈرونز اور میزائلوں سے جہازوں کو نشانہ بنا کر آبنائے ہرمز کو بند کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اب اُسے اثر و رسوخ بڑھانے کا ایک اچھا ذریعہ مل گیا ہے۔

ایرانی حکومت کی کوشش ہے کہ چھوٹے پیمانے ہی پر سہی، لڑائی جاری رہے کیونکہ اِس صورت میں وہ علاقائی ملکوں میں امریکی فوجی اڈوں کو نشانے بنانے کے جواز کا حامل ہوگا۔ فروری میں جب امریکا اور اسرائیل نے ایران کو نشانہ بنایا تھا تب ایران نے پورے خطے کو میدانِ جنگ میں تبدیل کرنے پر توجہ دی تھی۔ ایران علاقائی ملکوں کو بتا دینا چاہتا ہے کہ واشنگٹن سے قربت اُن کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

واشنگٹن اور تہران کے اندازے درست بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی۔ دونوں کو مسلسل لڑائی سے کچھ خاص حاصل نہیں ہونا مگر وہ اچانک لڑائی ختم بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اِس کے نتیجے میں دونوں کو سُبکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ کسی نہ کسی منطقی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ ایرانی قیادت مُصر ہے کہ امریکا ایران کے وجود کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ امریکا کسی بھی سطح پر خوفزدہ نہیں مگر وہ پسپائی کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا۔ امریکا نہ تو

اقتصادی پابندیاں کم کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی آبنائے ہرمز پر ایرانی اثر ورسوخ تسلیم کرنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اعترافِ شکست کے مترادف سمجھی جائیں گی۔

فریقین نے جون میں جنگ بندی کی امید میں ایک معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ دونوں ملکوں کو چند ترجیحات پوری کرنا تھیں جن میں آبنائے ہرمز کا کھولا جانا، ایران پر عائد پابندیوں کا اٹھایا جانا اور ایران کے ساتھ ساتھ اُس کے علاقائی اسٹریٹجک پارٹنرز پر حملے روکنا شامل تھا تاکہ ایٹمی پروگرام پر مذاکرات بحال ہوسکیں۔ بہت سے معاملات پر اتفاقِ رائے نہ ہوسکا۔ امریکا چاہتا تھا کہ آبنائے ہرمز سے جہاز رانی معمول کے مطابق ہو۔ تہران چاہتا تھا کہ نقل وحمل کا طریقہ وہ طے کرے اور فیس عائد کرے۔ امریکی حکام برہم ہوگئے۔ ایران نے امریکا پر منجمد اثاثے بحال کرنے میں تاخیری حربے اختیار کرنے کا الزام عائد کیا۔

یہ ناکامی اس بات کا اشارا نہیں ہے کہ تہران اور واشنگٹن مذاکرات نہیں کریں گے۔ وہ غالبًا بات چیت کو برقرار رکھیں گے اور صف بندی کے لیے وقتاً فوقتاً تنازع کو روک سکتے ہیں۔ سفارت کاری اور جنگ ایک ساتھ بھی ہوسکتی ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں شمالی کوریا اور امریکا پائیدار جنگ بندی تک پہنچنے سے پہلے برسوں تک سفارتی تعلقات میں مصروف رہے۔ جب تک تہران اور واشنگٹن ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے اہل اور عزم پر قائم رہیں گے، جنگ ختم نہیں ہوگی، چاہے وہ کتنی ہی باتیں کیوں نہ کرلیں۔

علاقائی نگرانی

ایران میں بھی کچھ تبدیلی آئی ہے۔ علی خامنہ ای کی شہادت نے ایران کو ایک مرکزی شخصیت سے محروم کردیا ہے۔ ایران کے خلاف جنگ شاید جمود کا شکار ہوچکی ہے۔ یہ تنازع اسلامی جمہوریہ اور اردگرد کے خطے دونوں کو تبدیل کر رہا ہے۔ روایتی طور پر ایران ایک پیچیدہ مطلق العنان حکومت رہا ہے جس میں ایسا سیاسی نظام موجود ہے جو مذہبی اختیار، منتخب اداروں، طاقتور سکیورٹی اور فوجی ایجنسیوں، مسابقتی نیٹ ورکس اور ایک متحرک معاشرے کو ملاتا ہے لیکن خامنہ ای کی موت نے حکومت کی اعلیٰ ترین شخصیت کو ختم کردیا جس سے توازن بگڑ گیا۔ اسلامی جمہوریہ کے پہلے سے کمزور ہوتے ہوئے ریاستی ادارے اب مزید کمزور ہوجائیں گے۔ ایران کی فوج اور اشرافیہ ایک بار پھر مذہبی خول میں بند ہوجائے گی۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ملک کے روایتی اقتدار کے غیر مسلح حصے اثر ورسوخ استعمال کرنے میں ناکام رہیں گے۔ سیاست دان اب بھی اس بات پر بحث کرسکتے ہیں کہ آیا ایران کو مذاکرات کی کوشش کرنی چاہیے اور ملک کتنی معاشی دقت برداشت کرسکتا ہے۔ ایرانی فوج اب بھی معاملات کو طاقت کے ذریعے درست کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ لڑائی جاری رکھنا چاہتی ہے۔ ایران میں اب تمام ہی معاملات جنگ اور سلامتی سے متعلق امور سے منسلک ہوکر رہ گئے ہیں۔ تمام ہی ریاستی اداروں کو سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کی چھتری تلے لایا جارہا ہے۔ حکومت کا مذہبی رنگ جاری رہے گا۔ جس مذہبی طبقے نے اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے لیے فوج کی آبیاری کی، وہ بالآخر اُسی کے ماتحت بھی ہوسکتا ہے۔

عرب خلیجی ریاستیں اپنی سلامتی یقینی بنانے کے لیے نئے سِرے سے تیاریاں کر رہی ہیں۔ ایران یہ سوچ کر مسرت محسوس کرسکتا ہے کہ امریکی انخلا سے علاقائی ریاستیں کمزور پڑیں گی اور ایران سے خوف محسوس کریں گی۔ دہائیوں تک واشنگٹن کو خطے میں شامل رکھنے کی کوششوں کے بعد اب خلیجی ریاستوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امریکا سے قریبی تعلقات اُنہیں ہدف بناتے ہیں۔ ویسے خلیجِ فارس کے خطے سے امریکا کے باہر نکلنے کا فی الحال امکان نہیں کیونکہ تمام خرابیوں کے باوجود اب بھی امریکا واحد ملک ہے جو عرب ریاستوں کو فوجی امداد فراہم کر رہا ہے۔ بہرکیف، ایک طرف تو امریکا پر خلیجی ریاستوں کا عدم اعتماد گہرا ہوا ہے اور دوسری طرف چند ریاستوں نے ایران کے خلاف جوابی کارروائی بھی کی ہے۔

اس بات کا امکان بھی ہے کہ علاقائی ممالک ایران سے بہتر اسٹریٹجک تعلقات اُستوار کرنے کو ترجیح دیں کیونکہ ایسی صورت میں اُن کی اپنی سلامتی کے لیے خطرات گھٹیں گے۔ امریکا سے بالکل قطعِ تعلق نہیں کیا جاسکتا۔ اسٹریٹجک تعلقات رہیں گے، ہاں اُن کی سطح نیچے آجائے گی۔ اس لڑائی سے اِتنا ضرور ہوا ہے کہ اب علاقائی ممالک اپنی دفاعی صلاحیت غیر معمولی حد تک بڑھانے پر متوجہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اُنہیں خود ہی لڑنا ہے۔

ایک کے بعد دوسری جنگ

یہ ممکن ہے کہ مستقبل کا کوئی حملہ یا واقعہ موجودہ توازن بگاڑ دے۔ جیسے جیسے دونوں ملک بے فکر ہوتے جائیں گے، وہ اپنے دفاع میں حد سے زیادہ پُراعتماد ہوسکتے ہیں اور تصادم بڑھانے کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ واشنگٹن ایرانی حکومت کو زیادہ خوفناک حملے کے ساتھ جھکنے پر مجبور کرنے کی طرف مائل ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی ایرانی میزائل بڑی تعداد میں امریکیوں کو ہلاک کردیتا ہے یا ایرانی حملہ خلیج کے اہم انفرااسٹرکچر کو بند کردیتا ہے تو امریکا بالآخر زمینی افواج کا استعمال کرنے یا ایران کے الیکٹرک گرڈ کو تباہ کرنے کا انتخاب کرسکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایرانی حکومت کمزور پڑسکتی ہے۔

ایرانی قیادت کو یہ سوچ بھی ترک کرنا پڑے گی کہ ایرانی عوام بہت طویل مدت تک شدید نوعیت کی پریشانیاں برداشت کرسکتی ہے۔ توانائی کے بحران اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مہنگائی ایرانی عوام کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ ایسے میں ایرانی حکومت کے لیے اپنا اقتدار برقرار رکھتے ہوئے امریکا سے لڑائی جاری رکھنا انتہائی دشوار ہوجائے گا۔

خیر، اِس وقت امریکا اور ایران کے لیے لڑائی جاری رکھنا بہت حد تک ممکن دکھائی دیتا ہے۔ واشنگٹن نے کوئی بھی بڑا ہدف حاصل نہیں کیا ہے اور لڑائی جاری رکھنے کی قیمت بھی بہت زیادہ ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ پھر بھی وہ ابھی کچھ مدت تک لڑسکتا ہے۔ امریکی قیادت یہ سمجھتی ہے کہ لڑائی روکنے اور غیر علانیہ طور پر شکست تسلیم کرنے کی قیمت اس لڑائی کو جاری رکھنے کی قیمت سے کہیں زیادہ ہے۔ بہت کچھ جھیلنے کے بعد بھی ایران قدرے مستحکم ہے اور سوچتی ہے کہ وہ معنی خیز مراعات دینے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

اس تنازع کا تضاد یہی ہے۔ دونوں فریق کمزور ہوکر اُبھرے ہیں۔ جیت کسی کی نہیں ہوسکتی لیکن وہ پھر بھی لڑائی جاری رکھنے پر تُلے ہوئے ہیں کیونکہ متبادل اُنہیں سخت ناگوار دکھائی دیتا ہے۔ (مترجم: ابوصباحت)

"The new forever war".
("Foreign Affairs". Sep 29, 2026)

* * *

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی تازہ پیشکش
قرآن کے زیرِ سایہ
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
قیمت: ۸۰۰ روپے
اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک-5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

بھارت: انتخابی فہرستوں کی ”تطہیر“

افتخار گیلانی

بھارتی دارالحکومت نئی دہلی میں انتخابی فہرستوں کی مبینہ تکنیکی صفائی یا تطہیر کی کارروائی جب پچھلے ماہ شروع ہوئی، تو معلوم ہوا کہ میرا اور میری اہلیہ کا نام لسٹ سے غائب ہے۔

جہاں تک مجھے یاد آرہا تھا کہ ۱۹۹۸ء سے میں اس لسٹ میں موجود تھا اور کئی بار ووٹ بھی ڈالے ہیں۔ بتایا گیا کہ صرف میری بیٹی کا نام لسٹ میں ہے، اور اب ثابت کرنا ہے کہ ہم اس کے والدین ہیں۔ خیر جب کسی طرح اسناد وغیرہ جمع کروا کے نام شامل ہوا تو دیکھا کہ میرے والد کا نام منوج گیلانی درج کیا گیا ہے۔

اب شاید ہی کوئی عام حالات میں ووٹر لسٹ میں شامل ہونے کیلئے تگ و دو کرتا، مگر معلوم ہوا کہ پاسپورٹ کی تجدید، بینک اکاونٹ وغیرہ اس کے ساتھ لنک کر دیے گئے ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ ابھی تک ۱۳؍کروڑ افراد کو ووٹر لسٹ سے نکالا گیا ہے۔ جب خاندانی منصوبہ بندی کے تمام روایتی طریقے ناکام ہوگئے، تو ایسا لگتا ہے کہ ۳۰ ریاستوں میں ووٹر لسٹوں سے بیک جنبشِ قلم ۱۳؍کروڑ افراد کو خارج کر کے آبادی پر قابو پانے کا یہ سب سے ’مثالی‘ اور انوکھا طریقہ نکال لیا گیا ہے۔

اس تطہیر کو عمومی طور پر ایک معمول کا دفتری عمل قرار دے کر قبول کیا جاسکتا تھا۔ لیکن تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ فسطائیت کبھی بھی بغیر کسی فکری اور نظریاتی سانچے کے جنم نہیں لیتی۔

بھارت کے موجودہ حالات اور اسپیشل انٹینسیو رویژن (ایس آئی آر) کے تحت ووٹر لسٹوں سے کروڑوں شہریوں کے اخراج کو سمجھنے کے لیے ہمیں ۲۰۱۴ء نہیں، بلکہ ۶۱ برس پیچھے جا کر اس فکری سرچشمے کو دیکھنا ہوگا جہاں مسلمانوں کو سیاسی طور پر غیر موثر بنانے کا باقاعدہ نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ ۱۷؍مئی ۱۹۶۵ء کو آندھرا پردیش میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے افسران کے تربیتی کیمپ میں بھارتیہ جن سنگھ کے دسویں صدر پنڈت دین دیال اپادھیائے نے ایک چشم کشا اور تاریخی خطاب کیا تھا۔

اپادھیائے اس خطاب میں نام نہاد ’مسلم مسئلے‘ پر بحث کر رہے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کے روحانی جانشین سمجھے جانے والے ونوبا بھاوے اور آر ایس ایس کے دوسرے سرسنگھ چالک یعنی سربراہ ایم ایس گولوالکر یعنی گرو جی کے درمیان ہونے والے ایک نجی مکالمے کو کیمپ کے تربیت یافتہ کیڈرز کے سامنے دہرایا۔

اپادھیائے نے کہا کہ گولوالکر نے ونوبا بھاوے کو بتایا کہ مسلم مسئلہ کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے، ’مسلمانوں کو مکمل سیاسی شکست دینی ہے۔ اس سیاسی شکست کے بعد ہی ہم انہیں اپنے اندر ضم یا یکجا کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔‘

جب ونوبا بھاوے نے گولوالکر کو بتایا کہ سنگھ مسلمانوں کی دشمن ہے، تو گرو جی نے وہ جملہ کہا جو آگے چل کر سنگھ کی پوری سماجی فکر کا محور بن گیا۔ ’ہم مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں۔ مسلمانوں میں کچھ افراد اچھے ہو سکتے ہیں اور ہندوؤں میں کچھ برے ہو سکتے ہیں۔ لیکن غور طلب نکتہ یہ ہے کہ ایک ہندو انفرادی طور پر برا ہوسکتا ہے مگر اجتماعی طور پر وہ فطرتاً اور پیدائشی طور پر اچھا ہے۔ اس کے برعکس، ایک مسلمان انفرادی طور پر اچھا ہوسکتا ہے، لیکن اجتماعی طور پر وہ فطرتاً ہی برا ہے۔‘

یہ تاریخی مکالمہ ثابت کرتا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی، انتخابی اور آئینی طور پر بے اثر اور بے اختیار بنانا محض بی جے پی کی انتخابی مجبوری یا ۲۰۱۴ء کے بعد کا اتفاقیہ عمل نہیں ہے۔ یہ سنگھ پریوار کا کم و بیش ساٹھ سال پرانا بنیادی منصوبہ ہے جس پر دہائیوں تک مختلف مراحل میں کام کیا گیا۔

بھارت کے جمہوری اور پارلیامانی نظام میں ہندو قوم پرستوں کو ہمیشہ ایک بڑی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوؤں میں ذات پات، لسانی و علاقائی تقسیم کے بعد مسلم ووٹرز کا سیکولر یا علاقائی پارٹیوں کے پلڑے میں ووٹ ڈالنے سے پاور کی طرف ان کے جانے کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔

لہٰذا گولوالکر کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہندو قوم پرستی کی سیاست نے تین باقاعدہ ادوار طے کیے۔ ۱۹۸۴ء کے انتخابات میں بی جے پی پارلیمنٹ میں صرف دو نشستوں پر سمٹ گئی تھی۔

اس لیے ذات پات کی تقسیم میں الجھی ہندو آبادی کو ایک مشترکہ مذہبی تشخص دینے کے لیے ایودھیا میں بابری مسجد کے تنازع کو ہتھیار بنا دیا گیا۔ ایل کے اڈوانی کی ۱۹۹۰ء کی رتھ یاترا اور ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت نے شمالی بھارت میں مذہبی پولرائزیشن کو گہرا کر دیا۔

اگرچہ اٹل بہاری واجپائی کے دور میں بی جے پی اقتدار تک پہنچی، لیکن وہ ایک ایسے مخلوط اتحاد (این ڈی اے) کی محتاج تھی جس میں شامل علاقائی پارٹیاں مسلم ووٹرز پر منحصر تھیں۔ یوں سنگھ کا پہلا مرحلہ طے ہوگیا یعنی اس کو سیاسی جواز ملا، مگر ابھی تک نظریاتی حاکمیت حاصل نہ ہوسکی تھی۔

اس لیے دوسرے مرحلے میں پولرائزیشن کا سہارا لیکر اکیلے اقتدار میں آنا تھا۔ ۲۰۱۳ء کے مظفر نگر فسادات کے بعد اتر پردیش میں نریندر مودی کے دست راست امت شاہ نے ذات پات میں بٹی ہندو برادریوں کو مسلمانوں کے خلاف ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا، جسے تجزیہ کاروں نے ’ریورس پولرائزیشن‘ کہا۔

سابق رکن پارلیمنٹ اور معروف صحافی شاہد صدیقی نے اپنی خودنوشت میں امت شاہ سے ہونے والی نجی گفتگو قلمبند کی ہے۔ صدیقی نے جب دریافت کیا کہ مسلمانوں کے تئیں بی جے پی کی پالیسی کیا ہوگی، تو شاہ نے کھلے لفظوں میں کہا کہ انہیں مسلم ووٹوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ اس پر کئی سال بعد ہی غور کریں گے۔

انہوں نے دوٹوک کہا، ’انتخابات اچھے کاموں پر نہیں، بلکہ جذبات پر جیتے اور ہارے جاتے ہیں۔‘

اس فارمولے کا اصل جوہر یہ تھا کہ مسلم اکثریتی یا مسلم اثر و رسوخ والے حلقوں میں متعدد سیکولر امیدوار کھڑے کر کے مسلم ووٹ کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے، جبکہ تمام غیر مسلم ووٹ بی جے پی کے ایک امیدوار کے پیچھے جمع کر دیے جائیں۔ ۲۰۱۴ء میں جن ۸۷ نشستوں پر مسلم آبادی ۲۰ فیصد سے زیادہ تھی، بی جے پی نے ان میں سے ۴۳ سیٹیں جیت لیں۔ مسلم ووٹ کی تزویراتی اہمیت کو صفر کر دیا گیا۔

سال ۲۰۱۹ء میں پلوامہ حملے اور بالاکوٹ ایئر اسٹرائیک نے پاکستان اور قومی سلامتی کو داخلی پولرائزیشن کا ایسا نعم البدل بنا دیا جس نے ہندو ووٹر کو تمام اندرونی معاشی و سماجی تضادات بھلا کر بی جے پی کو ۳۰۳ نشستیں دلا دیں۔

لیکن ۲۰۲۴ کے عام انتخابات میں اس فارمولے کی قلعی کھل گئی۔ پاکستان کارڈ بار بار نہیں چل سکتا تھا، چنانچہ انتخابی مہم پوری طرح مسلمانوں، دراندازوں اور ہندوؤں کی دولت چھیننے کے منفی بیانیے پر مرتکز کر دی گئی۔ اس کھلی منافرت کے باوجود بی جے پی ۳۰۳ سے گر کر ۲۴۰ پر آ گئی اور دہائی بعد اپنی واحد اکثریتی حاکمیت گنوا بیٹھی۔

زمینی مبصرین کا خیال تھا کہ اگر سرکاری مشینری بالخصوص انتخابی عملے کی مبینہ معاونت نہ ہوتی تو پارٹی ۲۰۰ کے پار بھی نہ جا پاتی۔ ۲۰۲۴ء نے بی جے پی قیادت کو خبردار کر دیا کہ ہندو یکجہتی کا نعرہ اب ہر بار اکثریت کی ضمانت نہیں بن سکتا۔

یہیں سے گولوالکر کے ۱۹۶۵ء کے فکری حکم کے مطابق وہ خطرناک ترین تیسرا مرحلہ شروع ہوا؛ جب ووٹر کی سوچ کو اپنے حق میں نہ موڑا جا سکے، تو خود ووٹر ہی کو فہرست سے مٹا دیا جائے۔ جون ۲۰۲۵ء کو الیکشن کمیشن آف انڈیا نے ریاست بہار میں اسپیشل انٹینسیو رویژن (ایس آئی آر) نافذ کرنے کا حکم جاری کیا۔

جواز پیش کیا گیا کہ چونکہ ۲۰۰۳ء کے بعد بہار میں ایسی کوئی تفصیلی مہم نہیں چلی، اس لیے نقل مکانی اور اموات کے پیش نظر لسٹوں کی 'تطہیر' ناگزیر ہے تاکہ کوئی نااہل فرد شامل نہ رہے اور کوئی اہل محروم نہ ہو۔ ایس آئی آر سے قبل بہار میں ۷ کروڑ ۸۹ لاکھ رجسٹرڈ ووٹرز تھے۔ ابتدائی ڈرافٹ میں سے لگ بھگ ۶۵ لاکھ ووٹرز کے نام یک جنبشِ قلم غائب کر دیے گئے۔ بعدازاں اپیلوں اور درستیوں کے نام نہاد عمل کے بعد بھی حتمی فہرست ۷ کروڑ ۴۲ لاکھ تک محدود رہی، یعنی کم و بیش ۴۷ لاکھ ووٹرز کو مکمل طور پر منہا کر دیا گیا۔

غور طلب پہلو یہ ہے کہ اسمبلی انتخابات میں بی جے پی کی قیادت والے این ڈی اے اور اپوزیشن کے مہا گٹھ بندھن کے درمیان جیت ہار کا فرق صرف ۵۷ لاکھ ووٹوں کا تھا۔ یعنی جس فرق سے حکومت بنی، اس سے کہیں زیادہ ووٹرز لسٹوں سے کاٹ دیے گئے تھے۔

بہار کے بعد دوسرے مرحلے میں یہ مشق ۱۲؍ریاستوں تک پھیلا دی گئی، جہاں ووٹروں کی کٹوتی کے ہوش ربا اعداد و شمار سامنے آئے۔ اتر پردیش، جو لوک سبھا میں ۸۰؍ارکان بھیجتا ہے، وہاں ۱۵؍کروڑ ۴۴ لاکھ کے الیکٹوریٹ میں سے ۲ کروڑ ۴ لاکھ سے زائد ووٹرز فائنل لسٹ سے کاٹ دیے گئے۔ تامل ناڈو میں تقریباً ۷۴ لاکھ نام خارج ہوئے۔

گجرات میں ۶۸ لاکھ، مدھیہ پردیش میں ۳۴ لاکھ ۲۵ ہزار، راجستھان میں ۳۱ لاکھ اور چھتیس گڑھ میں ۲۵ لاکھ ووٹرز کی چھانٹی کر دی گئی۔ لیکن اس حربے کی سب سے شاندار سیاسی کامیابی مغربی بنگال کے ۲۰۲۶ء کے اسمبلی انتخابات میں دیکھی گئی۔ بنگال میں بی جے پی کی راہ میں ہمیشہ مسلمانوں کی ۲۷ فیصد سے زائد آبادی رکاوٹ رہی ہے۔ بنگال میں ایس آئی آر کے تحت لگ بھگ ۹۰ لاکھ ووٹرز کے نام کاٹ دیے گئے، یعنی کل ووٹروں کا دسواں حصہ انتخابات کے وقت لسٹ سے باہر تھا۔

مسلم اکثریتی اضلاع جیسے مرشد آباد اور مالدہ میں کٹوتیوں کی شرح غیر معمولی تھی۔ بی جے پی کو ۲ کروڑ ۹۲ لاکھ ووٹ ملے اور اس نے ۲۰۷ نشستیں جیت کر بنگال پر تاریخ میں پہلی بار قبضہ کیا۔ ترنمول کانگریس ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ووٹ حاصل کر کے ۸۰ نشستوں پر ڈھیر ہو گئی۔ بی جے پی کی برتری محض ۳۲ لاکھ ۱۱؍ہزار ووٹ تھی، جبکہ دوسری طرف ۹۰ لاکھ ووٹرز کاٹے جا چکے تھے اور ۲۷ لاکھ افراد اپنی بے دخلی کے خلاف الیکشن کے وقت ٹریبونلز کے چکر کاٹ رہے تھے۔

مئی ۲۰۲۶ء کو شروع ہونے والے فیز ۳ میں دہلی، مہاراشٹر، کرناٹک، تلنگانہ سمیت ۱۶؍ریاستوں کے ۳۶ کروڑ ووٹرز کو لپیٹ میں لے لیا گیا۔ دہلی میں مجموعی الیکٹوریٹ کے ۳۲ء۸ فیصد یعنی ۴۷ لاکھ ۵۶ ہزار نام ڈرافٹ سے باہر کر دیے گئے۔ مہاراشٹر میں ۲ کروڑ ۶ لاکھ سے زائد ۲۱ء۱۴ فیصد نام نکالے گئے۔ شہروں کا حال یہ ہے کہ بنگلورو میں ۴۵ء۴ فیصد، حیدرآباد میں ۳۷ء۷ فیصد اور ممبئی میں ۳۵ء۲ فیصد ووٹرز معطل یا خارج کیے گئے۔

ملک بھر میں مجموعی طور پر اب تک تقریباً ۱۱؍کروڑ ۷۰ لاکھ ووٹرز انتخابی فہرستوں سے خارج کیے جا چکے ہیں۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے جو دنیا کی کئی بڑی جمہوریتوں کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ اتفاقی ہے یا اس کے پیچھے کوئی سائنسی اور انتظامی نظام کام کر رہا ہے؟ اس کا جواب الیکشن کمیشن کے نئے مرکزی ڈیجیٹل پلیٹ فارم ای سی آئی نیٹ کے ڈیزائن میں چھپا ہے۔

الیکشن کمیشن کی ڈائریکٹر جنرل آئی ٹی ڈاکٹر سیما کھنہ نے ٹیکنالوجی کو انتخابی شفافیت کا انقلابی ستون قرار دیا تھا۔ لیکن ستمبر ۲۰۲۶ء میں جو حقائق سامنے آئے، اس نے ظاہر کر دیا کہ یہ سافٹ ویئر دراصل الیکٹورل رجسٹریشن افسران (ای آر او) کے اختیارات چھین کر فیصلوں کو چند مرکزی نادیدہ ہاتھوں میں منتقل کرنے کا آلہ ہے۔

گوا کا واقعہ اس ڈیجیٹل جبر کی کھلی دستاویز ہے۔ وہاں ۹۷ باقاعدہ شہریوں کے نام سافٹ ویئر نے مبینہ ''لاجیکل تضاد'' کے تحت خارج کر دیے۔ جب مقامی الیکشن افسران نے زمینی تحقیق کر کے پایا کہ یہ تمام افراد قانونی طور پر مکمل حقدار ہیں، تو گوا کے چیف الیکٹورل آفیسر نے دہلی کو آٹھ بار خط لکھا کہ سافٹ ویئر میں ان ناموں کو بحال کرنے کی اجازت دی جائے۔

مگر جواب ملا کہ ای سی آئی نیٹ میں فارم ۷ کے تحت ڈیلیٹ کیے گئے ناموں کو واپس لانے کی کوئی سہولت ہی نہیں رکھی گئی۔ یعنی نظام میں جان بوجھ کر ایسا تالا لگایا گیا جس میں اخراج تو ممکن ہے مگر بحالی کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ سافٹ ویئر مسلم ناموں کو ازخود ڈیلیٹ کر دیتا ہے اور پھر کلیم کرنے پر ہی اور افسر کی صوابدید پر دوبارہ شامل کیا جاتا ہے۔

اس تکنیکی عمل کا سب سے ہولناک چہرہ جھارکھنڈ کے ضلع گودا میں روزنامہ ''انڈین ایکسپریس'' کی ۲ ستمبر ۲۰۲۶ء کی تحقیقاتی رپورٹ نے بے نقاب کیا۔ گودا کے چار بوتھوں میں بی جے پی کے بوتھ لیول ایجنٹس نے ووٹر لسٹوں سے ڈرافٹ میں شامل ووٹروں کے نام کاٹنے کے لیے فارم ۷ کے بلک بنڈل جمع کرائے۔ جب بوتھ لیول افسران (بی ایل او) نے جانچ کی، تو پتا چلا کہ جن ووٹروں کے نام خارج کرنے کی درخواستیں دی گئیں، وہ مسلمان تھے۔

بی جے پی کے ایک بوتھ ایجنٹ نے کیمرے کے سامنے اعتراف کیا کہ پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں نے اس کو مسلمانوں کے نام والے فارم دیے تھے جو اس نے نذر آتش کر دیے تھے۔

راجستھان کے الور میں مسلم نما ناموں کے خلاف مشتبہ تحریروں والے ہزاروں فارم ۷ جمع ہوئے اور حیدرآباد کے بہادر پورہ میں ایک ہی جھٹکے میں ۸۵ء۹ فیصد مسلم ووٹرز کے نام کاٹ دیے گئے۔

اس صورتحال سے خود الیکشن کمیشن کے اندر دراڑیں پڑ گئیں ہیں۔ انڈین ایکسپریس کی سینئر صحافی ریتیکا چوپڑا کے مطابق، الیکشن کمشنر سکھبیر سنگھ سندھو اور ویک جوشی نے کم از کم ۱۴؍بار ریکارڈ پر اختلافی نوٹ لکھے کہ فارم ۶ اور ڈیٹا بیس تک فیلڈ افسران کی رسائی کو آئی ٹی ونگ کے ذریعے سلب کرنا سراسر غیر قانونی اور غیر مجاز ہے۔

اگرچہ ۲۶ ستمبر کو فل کمیشن کے اجلاس میں بعض نمائشی رعایات کا اعلان کیا گیا، مگر اس نے کمیشن کے غیر جانبداری کے پردے کو چاک کر دیا۔

ایس آئی آر محض ووٹ کاٹنے کی مہم نہیں، بلکہ یہ بھارت کے پسماندہ ترین طبقات بالخصوص مسلمانوں کو شہری حقوق سے محروم کرنے کی منظّم کوشش ہے۔

حق معلومات (آر ٹی آئی) کے ذریعے حاصل کردہ اعداد وشمار، جن کا حوالہ ششی تھرور اور کرن تھاپر نے دیا، بتاتے ہیں کہ ٹریبونلز نے جن ۸۲ ہزار کیسز کا فیصلہ کیا، ان میں سے ۹۱ فیصد ووٹرز کو درست پایا گیا اور ان کے نام بحال کرنے پڑے۔

یہ ۹۱ فیصد کا ہندسہ چیخ چیخ کر گواہی دے رہا ہے کہ الیکشن کمیشن کی یہ مہم تکنیکی نہیں بلکہ دانستہ انتقامی اور غیر قانونی تھی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ الیکشن کے وقت ۳۷ لاکھ سے زائد اپیلیں زیر التوا تھیں اور وہ شہری ووٹ ڈالنے سے محروم رہے۔

سب سے لرزہ خیز پیشرفت یہ ہوئی ہے کہ اب انتخابی فہرست سے نام خارج ہونے کا تعلق سیدھا فرد کے بنیادی وجود اور اس کی بقا کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ بنگال میں حکومت بنتے ہی بی جے پی کی وزیر اگنی مترا پال نے کھلے عام اعلان کیا کہ جن لوگوں کے نام ایس آئی آر میں ووٹر لسٹوں سے کٹ گئے ہیں، انہیں سرکاری فلاحی اسکیموں، اناج اور راشن سے محروم کر دیا جائے گا۔

البتہ جو ہندو غیر قانونی تارکینِ وطن ہیں، وہ شہریت ترمیمی قانون (سی اے اے) کے تحت درخواست دے کر مراعات کے حقدار رہیں گے۔ ووٹر لسٹ سے نام کٹنے کے بعد شہریوں کے پاسپورٹ کی تجدید روک دی گئی ہے۔ تھانوں میں ویری فکیشن کے دوران ووٹر کارڈ نہ ہونے کو شہریت پر شکوک کی بنیاد بنا دیا جاتا ہے، جیسا کہ معروف انگریزی اخبار 'دی ٹیلی گراف' کے ایڈیٹر آر راج گوپال کے معاملے میں ہوا۔

عام شہریوں کو بینکوں کی طرف سے نوٹس جاری کیے جا رہے ہیں کہ وہ انتخابی فہرست میں اپنے نام کی موجودگی کے ثبوت لائیں، ورنہ ان کے اکاؤنٹس منجمد کر دیے جائیں گے۔

یوں آئین میں کسی بھی رسمی ترمیم کے بغیر بھارت کے اندر ایک ایسی ہولناک درجہ بندی قائم کر دی گئی ہے جس میں ایک وہ شہری ہے جس کی شہریت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، اور دوسرا وہ مظلوم مسلم یا پسماندہ شہری ہے جسے قدم قدم پر اپنی ہی مٹی پر اپنی وفاداری اور وجود کا دستاویزی ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔ اب ذرا گولوالکر کے ۱۹۶۵ء کے اس فکری ایجنڈے پر دوبارہ غور کیجیے کہ مسلم مسئلے کا واحد حل مسلمانوں کی مکمل سیاسی شکست ہے۔

بھارت کے انتخابی نقشے پر نظر ڈالیں تو ملک کے اندر لوک سبھا کے تقریباً ۱۳۸ ایسے حلقے ہیں جہاں مسلم ووٹرز کی تعداد ۱۵/ فیصد یا اس سے زائد ہے، اور ۸۷ حلقے ایسے ہیں جہاں وہ ۲۰ فیصد سے تجاوز کرتے ہیں۔ یہ وہ نشستیں ہیں جو اتر پردیش، بنگال، بہار، آسام، مہاراشٹر اور تلنگانہ میں بکھری ہوئی ہیں۔ موجودہ ووٹنگ سسٹم میں کسی حلقے میں الٹ پھیر کرنے کے لیے تمام مسلمانوں کو فہرست سے نکالنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

اگر ۳۵ فیصد مسلم آبادی والے حلقے میں سے منصوبہ بندی کے تحت صرف ۵ یا ۷ فیصد مسلم ووٹوں کو فارم ۷ یا 'لاجیکل ڈسرپینسی' کے نام پر منہا کر دیا جائے اور بقیہ ہندو ووٹرز کو یکجا کر لیا جائے، تو اقلیتی آبادی کی تزویراتی قوت پلک جھپکتے ہی راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ بھوانی پور میں ممتا بنرجی کی ۱۵/ ہزار ووٹوں سے شکست اور نئی دہلی میں اروند کیجریوال کا چار ہزار ووٹوں سے ہارنا اس امر کا ثبوت ہے کہ جہاں جیت کا فرق اتنا معمولی ہو، وہاں ہزاروں اور لاکھوں ووٹرز کی کٹوتی کس طرح اقتدار کا دھارا موڑ دیتی ہے۔

آج ۱۸ ویں لوک سبھا کا چہرہ دیکھیے: ۱۵/ فیصد آبادی رکھنے والے مسلمانوں کے ۵۴۳ کے ایوان میں محض ۲۴/ ارکان منتخب ہو سکے ہیں، یعنی کل ایوان کا محض ۴ء۴ فیصد۔ حکمران بی جے پی کا ایک بھی مسلم رکن پارلیمنٹ نہیں ہے۔ ۱۹۶۵ء میں پنڈت دین دیال اپادھیائے نے آر ایس ایس کے جس کیڈر کو گرو گولوالکر کا فلسفہ پڑھایا تھا، ایس آئی آر (ایس آئی آر) کی شکل میں اس فکری مہم کا دائرہ مکمل ہو چکا ہے۔

پہلا مرحلہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو قانون ساز اداروں کی نمائندگی سے بے دخل کیا جائے۔ اور اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان سے یہ طاقت بھی چھین لی جائے کہ وہ یہ طے کر سکیں کہ حکومت کون کرے گا۔

یہ معاملہ کسی الیکشن کمیشن کی کلیریکل غلطیوں کا نہیں ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے اندر آئین کا گلا گھونٹ کر ایک اکثریتی نسلی ریاست تعمیر کرنے کا سوچا سمجھا سائنسی منصوبہ ہے۔

اگر ملک کی اعلیٰ ترین عدالت، آزاد ادارے اور بیدار شہری اس ڈیجیٹل اور انتخابی بے دخلی کے خلاف سینہ سپر نہ ہوئے، تو بھارت کے مسلمان اپنے ہی وطن میں قانونی اصطلاح میں تو شاید شہری کہلائیں گے، لیکن حقیقت میں وہ ووٹ، وقار اور وجود سے محروم ایک بے دست و پا رعایا بن کر دوسرے درجے کے شہری بن کے رہ جائیں گے۔

اور یہی وہ گھناؤنی منزل تھی جس کی نشاندہی ایم ایس گولوالکر نے ۱۹۶۵ء کے اس تربیتی کیمپ میں کی تھی۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۳۰ ستمبر ۲۰۲۶ء)

بقیہ: اب پیوٹن کیا کریں گے؟

تربیت کے حامل اور ناقص سامان سے لیس فوجیوں کو اکٹھا کرنے کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ پیوٹن اپنے لیے مزید گہرا گڑھا کھود رہے ہیں۔ یوکرین اس سال ۷۰ لاکھ ڈرون تیار کرے گا جن میں سے کم ازکم ۶۰ لاکھ ڈرونز کا صرف ایک مقصد ہے۔۔۔ ایک ایک جارح روسی کو ہلاک کرنا۔

یورپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟

اب بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر پیوٹن اپنی فوج کو یورپی یونین کے کسی شہر پر قبضے پر کس نوعیت کے ردِعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ یورپ فوری طور پر یوکرین کی اور زیادہ مدد کرنے کا عندیہ دے گا اور امریکا بھی دوبارہ سنجیدگی سے اُن کی مدد شروع کر سکتے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کے لیے لازم نہیں کہ آپ نے ہارورڈ سے ٹاپ کیا کہ اگر پیوٹن امریکی وسط مدتی انتخابات سے کچھ ہفتے پہلے ٹرمپ کو ذلیل کرتے ہیں (جو انتخابات سے پہلے ہی ٹرمپ کی پارٹی کے لیے بہت مشکل ہوتے دکھائی دے رہے ہیں) تو ٹرمپ شدید طیش میں آجائیں گے۔ یہ بات اس لیے بھی زیادہ صادق آتی ہے کہ ٹرمپ نے حال ہی میں آن ریکارڈ کہا ہے کہ جب تک وہ صدر ہیں، نیٹو کے کسی بھی رکن ملک کے کسی علاقے پر روس حملہ نہیں کرے گا۔

اگر روس نے نیٹو کے کسی رکن پر حملہ کیا تو مغربی یورپ میں بالعموم اور فرانس میں بالخصوص اہم سیاسی نتائج برآمد ہوں گے۔ پیوٹن کے انتہائی دائیں بازو اور انتہائی بائیں بازو کے حامیوں کو وضاحت دینا پڑے گی۔

ناروا کا منظرنامہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ بس یاد رکھیں کہ عظیم مزاح نگار پیئر ڈیک (Pierre Dac) کہا کرتے تھے کہ پیش گوئی ایک مشکل فن ہے، خاص طور پر جب مستقبل سے نپٹنا ہو! بہتر تو یہ ہوگا کہ پیوٹن یوکرین جنگ کی توسیع سے باز رہیں اور کسی بھی نیٹو رکن پر حملے سے باز رہیں۔ اُن کے بارے میں شی جن پنگ کی بڑھتی ہوئی کوفت اُمید کی ایک چھوٹی سی کرن فراہم کرتی ہے۔ پھر بھی جیسا کہ مجھ جیسے ہر فرانسیسی کو معلوم ہونا چاہیے حملے کی غلط پیش گوئی سے بھی بُری چیز ہے حملے کو واقع ہوتا ہوا دیکھنے میں ناکام رہنا۔

(مترجم: ابوصباحت)

"Why Putin’s next move in his war against Ukraine is against Europe".
("The Globalist". Sep 6, 2026)

* * *

نئے سیکرٹری جنرل کا قضیہ

Steve Bloomfield

جنگوں اور ماحولیاتی بحران کی دنیا میں ایک نیا قائد ہی اقوامِ متحدہ کو بچا سکتا ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ کیا ٹرمپ اس کی اجازت دیں گے؟

اگر سب کچھ منصوبے کے مطابق ہی ہوتا رہا تو آنے والے ہفتوں میں کسی بھی وقت ۵۱ سفارت کار نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے ہیڈکوارٹرز کے اندرونی حصے میں واقع ایک چھوٹے، ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر نکلیں گے اور تنظیم کے نئے سیکرٹری جنرل کا اعلان کریں گے۔

اقوامِ متحدہ کے قیام کو ۸ دہائیاں گزر چکی ہیں۔ اِن ۸ دہائیوں میں عالمی ادارہ وہ سب کچھ نہیں کر پایا ہے جس کے لیے اِسے قائم کیا گیا تھا۔ دنیا بھر میں جنگیں ہوتی رہی ہیں، خانہ جنگیوں کا بازار گرم رہا ہے۔ عمومی ترقی کے اہداف حاصل کرنے میں اب تک بھرپور کامیابی ممکن نہیں بنائی جاسکی ہے۔

ایسے میں بہت سوں کا شِکوہ یہ ہے کہ اس ادارے کو خواہ مخواہ برداشت کیا جارہا ہے۔ اُن کے خیال میں لازم ہو چکا ہے کہ اِسے ختم کر کے نیا سیٹ اپ لایا جائے اور چند ابھرتی ہوئی معیشتوں کو بھی اُن کا جائز مقام دیا جائے۔ سلامتی کونسل میں افریقا کی نمائندگی ہے نہ مسلم دنیا۔ فرانس عالمی سیاست و معیشت پر بہت زیادہ اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہیں رہا مگر وہ اب بھی سلامتی کونسل کا مستقل رکن ہے۔ برازیل غیر معمولی رفتار سے مضبوط ہوکر، ابھر کر سامنے آیا ہے۔ وہ بھی سلامتی کونسل کی دائمی رکنیت کا خواہاں ہے اور بہت حد تک اِس کے لیے مطلوب معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔ بھارت بھی سلامتی کونسل کی دائمی رکنیت کا خواہاں ہے۔

اقوامِ متحدہ کو ختم کر کے تمام اقوامِ عالم کا نیا، مضبوط اور متوازن ادارہ قائم کرنے کی صورت ہی میں عالمی سطح پر کسی واضح بہتری کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اِس وقت یہ ادارہ امریکا اور یورپ کا غلام ہوکر رہ گیا ہے۔ سلامتی کونسل کی دائمی رکنیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکا اور یورپ، دنیا بھر میں جنگوں اور خانہ جنگیوں کا بازار گرم رکھا ہوا ہے۔ جب بھی کسی خطے میں بہتری کے لیے کوئی اہم قرارداد پیش کی جاتی ہے، امریکا، برطانیہ اور فرانس اُسے ویٹو کردیتے ہیں۔ معاملہ جب جنرل اسمبلی میں جاتا ہے تو ٹُھس اور ٹھپ ہوکر رہ جاتا ہے۔ جنرل اسمبلی کی کسی بھی قرارداد کی عملی سطح پر کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس ادارے کی منظور کی ہوئی قراردادوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے۔

یہ سوال ایک زمانے سے گردش کر رہا ہے کہ اقوامِ متحدہ جیسے عضوِ معطل کی حیثیت اختیار کر جانے والے ادارے کو کب تک برداشت کیا جائے گا اور کب تک عالمی یا بین الاقوامی تعلقات کو داؤ پر لگانے کی روش پر سفر جاری رکھا جائے گا۔ یہ سوال بے جا بھی نہیں اور غیر منطقی بھی نہیں۔ اقوامِ متحدہ وہ ادارہ ہے جس میں پوری دنیا کی نمائندگی ہے مگر اِس ادارے نے جنگیں روکی ہیں نہ خانہ جنگیاں۔ دنیا بھر میں عسکریت پسند گروپ کام کر رہے ہیں مگر یہ ادارہ اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ بڑی طاقتوں نے اِسے کھلونے کی شکل دے دی ہے۔ اِس سے کھیلتے ہوئے پسماندہ اور کمزور اقوام کو دھوکا دیا جاتا ہے، بہلایا جاتا ہے۔

اس کی حالت یہ ہے کہ ایک بڑا عالمی ادارہ موجود ہے مگر کسی کام کا نہیں۔ ویٹو پاور نے اِس ادارے کو نمائش کا آئٹم بنا دیا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ دنیا بھر میں خرابیاں چل رہی ہیں اور اُنہیں روکنے کا کوئی جامع اور کارگر میکینزم موجود ہے نہ کام کر رہا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے لیے نئے سیکرٹری جنرل کی تلاش جاری ہے۔ عالمی ادارے کے لیے جس شخص کا سربراہ کی حیثیت سے انتخاب ہوگا، اُسے ایسے چیلنجوں کے مجموعے کا سامنا ہوگا جو اُس کے پیشروؤں نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ عالمی ادارے اور اُس کے سربراہ کے لیے چیلنج دن رات بڑھ رہے ہیں۔ طاقت کی لڑائی شدت اختیار کرتی جارہی ہے۔ یورپ پیچھے ہٹ چکا ہے۔ وہ طاقت کی لڑائی سے خود کو بظاہر دور کرتا جارہا ہے۔ اُسے صرف اِس بات سے غرض ہے کہ اُس نے جو ترقی اور خوشحالی یقینی بنائی ہے، وہ کسی نہ کسی طور برقرار رہے۔ جنگوں اور خانہ جنگیوں میں الجھنے سے بھی اب یورپ کو کچھ خاص شغف نہیں رہا۔

سلامتی کونسل کے دو مستقل ارکان امریکا اور روس، اپنی مرضی کی ایسی جنگوں میں مصروف ہیں جن کا کوئی اختتام یا منطقی نتیجہ نظر نہیں آتا۔ روس خود کو منوانے کے چکر میں یوکرین میں ایک بڑی جنگ چھیڑ بیٹھا ہے۔ یوکرین تو تباہ ہوا ہے مگر خود روس بھی محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ امریکا اور یورپ نے اب تک عملی سطح پر یوکرین کا ساتھ نہیں دیا اور یہ محض اِس خدشے کے تحت ہوا ہے کہ کہیں جنگ کا دائرہ وسعت اختیار نہ کرے اور کسی عالمی جنگ میں تبدیل نہ ہوجائے۔

اقوامِ متحدہ کے ایک تحقیقاتی کمیشن نے اسرائیل پر غزہ میں نسل کُشی کا الزام عائد کیا ہے لیکن ڈونلڈ ٹرمپ کے قائم کردہ ''بورڈ آف پیس'' کے ذریعے باہر دھکیلے جانے کے بعد اقوامِ متحدہ عملاً ایک تماشائی کے کردار تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ اسرائیل اور امریکا کا اتحادی پوری دنیا کے لیے چیلنج بنا ہوا ہے۔ یورپ اِس معاملے سے دور رہنے کو ترجیح دے رہا ہے۔

دنیا بھر میں ماحول کی گراوٹ نے نئے انسانی المیوں کو جنم دیا ہے۔ پسماندہ ممالک کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ ماحول میں پیدا ہونے والی گراوٹ نے اُنہیں ڈھنگ سے جینے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ایشیا، افریقا اور لاطینی امریکا کے بیشتر انتہائی پسماندہ ممالک میں ماحول کی گراوٹ سے پیدا ہونے والے خطرات انتہائی پریشان کن ہیں کیونکہ مجموعی طور پر اربوں افراد کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

مصنوعی ذہانت کی بے لگامی سلامتی کے حوالے سے دن بہ دن نئے نئے خطرات پیدا کر رہی ہے۔ بڑے ممالک مصنوعی ذہانت (اے آئی) کے ذریعے اپنی طاقت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اے آئی کی بے لگامی دنیا کو کسی بہت بڑے بحران یا عالمی جنگ کی طرف دھکیل رہی ہے اور اس خطرے کا سامنا کرنے کے بارے میں ڈھنگ سے سوچا تک نہیں جارہا۔

یہ سب کچھ ایک ایسی دنیا میں ہو رہا ہے جہاں اقوامِ متحدہ کے بنیادی اصول (کثیرالجہتی ہم آہنگی، قواعد وضوابط پر مبنی نظام اور بین الاقوامی قانون) شدید خطرے میں ہیں۔ عالمی ادارہ جن مقاصد کے حصول کے لیے قائم کیا گیا تھا، اُن کے حصول کی راہ میں اب وہی ممالک حائل ہیں جنہوں نے اِسے قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ امریکا اور یورپ نے عشروں تک اس ادارے سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور اِسے عملاً عضوِ معطل کی حیثیت دے کر اپنے اسٹریٹجک مفادات کو ناقابلِ یقین حد تک محفوظ کیا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا انتخاب شاذ و نادر ہی اس قدر اہم رہا ہے۔ اور اس پر بھی کبھی بہت زیادہ بحث نہیں ہوئی کہ کسے جیتنا چاہیے۔ عالمی ادارے کے نئے سربراہ کے انتخاب کے حوالے سے بحث اس ہفتے اور اگلے ہفتے اقوامِ

متحدہ کی جنرل اسمبلی کے حاشیے پر چھائی رہے گی کیونکہ عالمی رہنما اپنے سالانہ اجلاس کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کو اور جس کی یہ نمائندگی کرتا ہے، اُس دنیا کو شدت سے ایک ایسے نئے قائد کی ضرورت ہے جو بارُعب شخصیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ باصلاحیت بھی ہو۔ سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان (امریکا، برطانیہ، روس، چین اور فرانس) ویٹو کا اختیار رکھتے ہیں۔ جو بھی اس عہدے کا خواہش مند ہے، اُسے شی جن پنگ، ولادیمیر پیوٹن اور سب سے بڑھ کر ڈونلڈ ٹرمپ کی منظوری کی ضرورت ہوگی۔

کسی بھی امیدوار کے لیے یہ موقع انتہائی نوعیت کی پیچیدگی والا ہے کیونکہ وہ تو اپنے آپ کو بہترین امیدوار قرار دے گا اور چاہے گا کہ عالمی ادارے کی سربراہی کے لیے اُسے منتخب کیا جائے تاہم جس شخص کو اُسے قائل کرنا ہے، وہ خود اِس ادارے کی ناکامی کا خواہاں ہے۔

اب تک تین غیر رسمی رائے شماری (اسٹرا پولز) ہو چکی ہیں اور کوئی واضح امیدوار سامنے نہیں آیا ہے بلکہ گزشتہ جمعہ کی ووٹنگ میں دو اہم امیدواروں کی مخالفت میں اضافہ ہوا۔ تنظیم کی ۸۰ سالہ تاریخ میں پہلی بار خاموشی سے اس بات پر سنجیدہ بات چیت ہو رہی ہے کہ اگر کسی سیکرٹری جنرل کا انتخاب ہی نہ ہو سکے تو کیا ہوگا۔

دس سال پہلے جنوبی کوریا کے بان کی مون کی ''سرد مہرانہ'' قیادت کے بعد پُرتگال کے انتونیو گوٹریس کے انتخاب کو اقوامِ متحدہ کے لیے ایک نئی توانائی کے طور پر وسیع پیمانے پر سراہا گیا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے پناہ گزین و مہاجرین کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے سابق کردار میں وہ خاصے فعال رہے تھے اور اُنہوں نے دنیا کے مظلوم ترین لوگوں کے لیے آواز اٹھاتے رہنے کا عہد کیا تھا۔ پھر، ایک مہینے بعد، ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکی صدر کا منصب سنبھالا۔

اُس سال کے شروع میں ٹرمپ نے اقوامِ متحدہ کی ۱۳ تنظیموں سے امریکا کی علیحدگی کا اعلان کیا جن میں ماحولیاتی تبدیلی اور خواتین کی صحت کے ذمہ دار ادارے بھی شامل ہیں جبکہ جولائی میں اُن کے وزیرِ خارجہ مارکو روبیو نے انتظامیہ کی بین الاقوامی فوجداری عدالت (ICC) کو ''اینٹ سے اینٹ بجا کر ختم کرنے'' کی خواہش کا اعلان کیا۔ امریکا کے امدادی اور ترقیاتی پروگرام (USAID) کی اچانک بندش سے دنیا بھر میں ہلاکتیں ہوئیں۔

سب سے متنازع بات یہ ہے کہ ٹرمپ کے ''بورڈ آف پیس'' کے قیام نے یہ خدشات پیدا کر دیے کہ اسے خود اقوامِ متحدہ کی جگہ لینے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اِس دوران اقوامِ متحدہ مالیاتی بحران کی زد میں ہے اور گوٹریس نے گرمیوں کے دوران خبردار کیا تھا کہ واجب الادا بقایا جات، جن میں سے بیشتر امریکا کے ذمے ہیں، عدم وصولی سے ادارہ ''فوری مالیاتی تباہی'' کے خطرے کا سامنا کر رہا ہے۔

بہت سے بحرانوں اور مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد بھی اقوامِ متحدہ برقرار ہے اور کسی نہ کسی طور کام کر رہا ہے۔ یہ صرف اقوامِ متحدہ ہے جو ماحول کی تبدیلی سے متعلق اپنے فریم ورک کنونشن کے ذریعے دنیا کے سب سے بڑے بحران پر بین الاقوامی توجہ حاصل کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہا ہے۔ فنڈنگ میں شدید کٹوتیوں کے باوجود دنیا کے خطرناک ترین علاقوں میں ۵۰ ہزار سے زائد اہلکاروں پر مشتمل گیارہ امن مشن اب بھی فعال ہیں۔ انسانی امور کی ہم آہنگی کے لیے اقوامِ متحدہ کا دفتر (OCHA) سوڈان سمیت جنگ زدہ علاقوں میں امداد پہنچانے کے لیے راستے تلاش کرنے کی بہترین اُمید بنا ہوا ہے۔

رواں جنرل اسمبلی نے دو تاریخی قراردادیں منظور کیں۔ ایک میں بحرِ اوقیانوس کے آر پار غلاموں کی تجارت کو جرم تسلیم کیا گیا اور دوسری میں دنیا کے ایک نئے نقشے کو اپنایا گیا جو افریقا کے حقیقی حجم کو صحیح طور پر تسلیم کرتا ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ سیکرٹری جنرل کے منصب کے امیدواران فیصلوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں نہ ہی ہم یہ جانتے ہیں کہ یوکرین کی جنگ پر اُن کا کیا موقف ہے یا غزہ میں اسرائیل کے اقدامات پر اُن کا کیا نقطۂ نظر ہے۔ انتخابات کی اہمیت اور مستقبل کے وژن کے بیانات اور انتخابی مہم کی نسبتاً حالیہ شفافیت کے باوجود امیدواروں کی انتخابی مہم حد سے زیادہ محتاط رہی ہیں۔

ایک بات تو طے ہے۔۔۔ یہ کہ جو اُمیدوار خاصے بلند عزم کے ساتھ کسی انقلابی ایجنڈے کے ساتھ کھڑا ہوگا، اُس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ امریکا بھی نہیں چاہتا کہ عالمی ادارہ کوئی بڑا مثبت اور تعمیری کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔ پسماندہ اور ترقی پذیر دنیا کو ابھرنے سے روکنے کے لیے عالمی اداروں کو کمزور رکھنا امریکا اور یورپ کے ایجنڈے پر سرِفہرست رہا ہے۔ روس اور چین کمر کس کر میدان میں آ چکے ہیں اور ساتھ ہی برازیل اور بھارت بھی امریکی اور یورپی بالادستی کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ بھارت اپنی بڑی مارکیٹ اور مختلف شعبوں میں غیر معمولی صلاحیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بڑی معاشی اور سیاسی قوت بننے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ چین اُس کی راہ میں دیوار ہے اور روس سے بھی بھارت کے تعلقات اب وہ نہیں رہے جو نہرو اور اندرا گاندھی کے ادوار میں ہوا کرتے تھے۔ ایسے میں عالمی ادارے کے اگلے سربراہ کے لیے کام آسان نہ ہوگا۔ ایک طرف تو اُسے پسماندہ ممالک کے حقوق کا دفاع کرنا ہے اور دوسری طرف بڑی طاقتوں کو لگام بھی ڈالنا ہے۔ امریکا چاہتا ہے کہ عالمی ادارہ محض چابی والے کھلونے کی طرح کام کرتا رہے۔ اگر وہ اپنی ضد سے باز نہ آیا تو کسی بڑے، عالمگیر بحران کی راہیں مسدود کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں رہے گا۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"In a world of wars and climate crisis, a new leader could save the UN. But would Trump allow it?" ("The Guardian". Sep 20, 2026)

* * *

اسلامك ریسرچ اکیڈمی کراچی کی مطبوعات

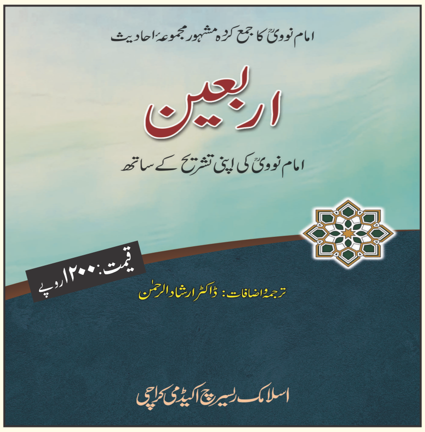
امام نوویؒ کا جمع کردہ مشہور مجموعۂ احادیث
اربعین
امام نوویؒ کی اپنی تشریح کے ساتھ
قیمت: ۱۲۰۰ روپے
ترجمہ و اضافات: ڈاکٹر ارشاد الرحمٰن
اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

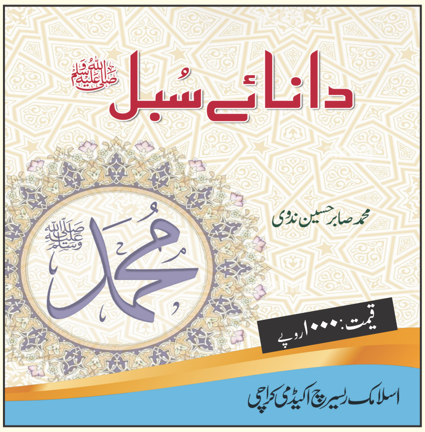

اکیڈمی بک سینٹر۔ ڈی ۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: ۳۶۳۶۸۰۲۰

جنگ سے انکار لازم ٹھہرا

Lex Syd

امریکی فوجیوں کو ٹرمپ کی غیر قانونی جنگوں میں لڑنے سے انکار کر دینا چاہیے۔

ایران پر حملہ امریکا کے حکمرانوں کے مفاد میں ہے، عوام کے نہیں۔ کیا فوجی قیادت آپ کو ایک اور بے مقصد جنگ میں جھونک کر صاف بچ نکلے گی؟

اگر آپ اس وقت امریکی فوج میں خدمات انجام دے رہے ہیں تو یہ وقت اپنی خدمات پر نئے سِرے سے غور کرنے کا ہے۔ اگر آپ کو مشرقِ وسطیٰ میں تعینات کیا گیا ہے تو ایسا کیے جانے پر معترض ہوں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو معلومات میڈیا تک پہنچائیں۔ اور اگر آپ فوج میں بھرتی ہونے کا سوچ رہے ہیں تو اپنی یہ سوچ ترک کر دیں۔

آپ کے وقت اور صحت کو ایران کے ساتھ ایک غیر اخلاقی اور بے معنی تنازع کی قربان گاہ پر چڑھانا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔ ایسے کسی بھی تنازع یا جنگ کے شدید منفی اثرات اُن سیاسی قائدین پر مرتب نہیں ہوں گے جو آپ کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے ہیں بلکہ آپ کو، آپ کے خاندان کو اور ہر اُس عام امریکی گھرانے کو شدید نقصان پہنچے گا جس کی سلامتی یقینی بنانے کا آپ نے حلف اٹھایا تھا۔ اِن گھرانوں نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ اِس معاملے میں خود کو بھی مصیبت میں ڈالیں اور قوم کو بھی۔

عسکری اور سیاسی رہنما طویل عرصے سے آپ کی زندگیوں سے کھیلتے آئے ہیں اور بظاہر ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ اگر آپ ابھی مزاحمت کریں گے تو وہ آپ کو خطرے میں ڈالنے سے پہلے دو بار سوچنے پر مجبور ہوں گے۔ جنگ میں عارضی ٹھہراؤ کے وقت ابھی اقدام کرنا، اُس وقت سے کہیں بہتر ہے جب حالات قابو سے باہر ہو چکے ہوں۔

ایک غیر مقبول اور ناانصافی پر مبنی جنگ کے دوران عام فوجیوں کا اپنے اختلافی جذبات کا اظہار ایک انتہائی طاقتور حلقہ بن سکتا ہے۔ ہم نے یہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کی ’’جی آئی موومنٹ‘‘ میں واضح طور پر دیکھا تھا جب امریکا کے حاضر سروس اور سابق فوجیوں نے احتجاج کی اُس لہر میں حصہ لیا جس نے ویتنام جنگ کے خاتمے میں مدد کی۔ اس نوعیت کا احتجاج دنیا بھر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ روس میں سوویت۔افغان جنگ سے دل برداشتہ سابق فوجیوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں سیاسی تبدیلی میں اپنا کردار ادا کیا جس نے دہائیوں بعد ولادیمیر پیوٹن کو مجبور کیا کہ وہ یوکرین جنگ کے سابق فوجیوں کو زیادہ بڑا سیاسی کردار دیں۔ ۲۰۲۲ء میں ممکنہ طور پر بھرتی ہونے والے افراد کی شدید مزاحمت نے آمرانہ قائد کو جبری بھرتی کی کوششوں سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ کے ہر دور کا یہی انداز رہا ہے۔ سکندرِ اعظم نے معلوم دنیا کا بیشتر حصہ فتح کر لیا تھا مگر جب ہندوستان میں اُس کے فوجیوں نے بغاوت کی تو اُسے بھی رُکنا پڑا۔ حاصلِ کلام و بحث یہ ہے کہ اگر سپاہی نہ لڑیں تو جیتنا دُور کی بات ہے، جنگیں لڑی بھی نہیں جاسکتیں۔

جو اہلکار یہ سوچ کر پریشان ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری سے جی چُرا رہے ہیں، اُنہیں صرف اپنے کمانڈر اِن چیف کی طرف دیکھنا چاہیے جو اُنہیں فرنٹ لائن پر بھیج رہا ہے۔ ایک نوجوان ڈونلڈ ٹرمپ نے پانچ بار جبری فوجی بھرتی سے راہِ فرار اختیار کی تھی کیونکہ وہ درست طور پر سمجھ گئے تھے کہ ویتنام کی جنگ میں مرنا بے مقصد تھا۔

بہت سے لوگ یہ دلیل دیں گے کہ فوجی اہلکار صرف اپنی مرضی کے مطابق تنازعات کا انتخاب نہیں کر سکتے؛ اور یہ کہ عسکری خدمت کی نوعیت تعریف کے لحاظ سے ذاتی آزادیوں کی منفرد قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر فوجی اہلکار جب چاہیں نوکری چھوڑ کر چلے جائیں تو فوج رکھنے کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے۔

اس بات میں کچھ حد تک سچائی ہے لیکن سِکّے کے دوسرے رُخ پر کم ہی لوگ غور کرتے ہیں۔ ریاست بھی اِن قربانیوں کو ہلکا نہیں لے سکتی۔ جب فوجی کسی ایسے مقصد کے لیے شہید یا زخمی ہوتے ہیں جس کی کوئی منطق نہیں ہوتا، جواز نہیں ہوتا (اور ایسا تو اکثر ہوتا ہے) تب فیصلہ سازوں کو نتائج کا سامنا کرنا چاہیے، ورنہ وہ اپنی غلطیاں دُہراتے رہیں گے اور فوج کے ساتھ ساتھ قوم بھی داؤ پر لگتی رہے گی۔

یہ قانونی طریقِ کار قانون کے دائرے میں بھی سامنے آتا ہے۔ صدر ٹرومین پہلے شخص تھے جنہوں نے کانگریس سے جنگ کا باضابطہ فیصلہ اور اعلان حاصل کیے بغیر (جیسا کہ آئین کا تقاضا ہے) کسی تنازع میں قدم رکھا اور اِس اقدام نے بعد میں آنے والے ہر صدر کے لیے ایک مثال قائم کر دی۔ اِتنا ضرور ہے کہ اب تک صدور کم از کم بڑے تنازعات کے لیے کانگریس کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر ایران سے جنگ قانون سازوں یعنی کانگریس کے ارکان سے مشاورت کیے بغیر چھیڑ دی گئی۔ یہ طاقتوں کی تقسیم (Separation of Powers) اور ۱۹۷۳ء کے ’’وار پاورز ریزولیوشن‘‘ کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی ہے جس کے تحت فوجیوں کی غیر منظور شدہ تعیناتی کو ۶۰ دنوں تک محدود رکھنا لازمی ہے۔ اگر اب مزاحمت نہ کی گئی تو یہ قانون بے معنی ہو جائے گا اور صدور پر بڑی جنگیں شروع کرنے کے حوالے سے کوئی پابندی عائد نہیں رہے گی۔

امریکیوں کو آج ایک احمقانہ اور غیر اخلاقی منصوبے کے لیے خطرے میں ڈالا جا رہا ہے۔ امریکی محکمۂ دفاع نے عراق اور افغانستان میں بلا کسی خاص جوابدہی کے مسلسل دو بار ایسا کیا۔ اور دردناک المیہ یہ ہے کہ اگر آج ایران میں مزید فوجی اہلکار ہلاک ہوتے ہیں تو اُن کی جانوں کا ضیاع فیصلہ سازوں کو آئندہ بے مقصد تنازعات میں مزید زندگیاں ضائع کرنے کا موقع فراہم کرے گا۔

احکام اور اطاعت

جنگ میں بھیجنے والوں اور جنگ میں جانے والوں کے درمیان خلیج انتہائی عبرت ناک ہے۔ ایک حالیہ مثال پیشِ خدمت ہے۔ گزشتہ خزاں میں پینٹاگون نے آئی رِب اسٹیک پر ایک کروڑ ۵۱ لاکھ ڈالر، لابسٹر پر ۶۹ لاکھ، الاسکن کنگ کریب پر ۲۰ لاکھ ڈالر اور ایئر فورس کے چیف آف اسٹاف کی رہائش گاہ کے لیے ایک گرینڈ پیانو پر ۹۸ ہزار ڈالر خرچ کیے۔ اس کی منطق یہ پیش کی گئی کہ پینٹاگون مالی سال ۲۰۲۵ء کے آخری مہینے میں ’’استعمال کرو یا ضائع کرو‘‘ کے اصول کے تحت اربوں ڈالر خرچ کرنے کے طریقے تلاش کر رہا تھا!

اسٹیک پر اڑائے گئے ان کروڑوں ڈالرز کا موازنہ یو ایس ایس ابراہم لنکن اور خطے میں موجود دیگر بحری جہازوں پر ملنے والے کھانے سے کریں۔ یہ سارا بگاڑ پیدا کرنے والے عسکری منصوبہ سازوں کو اسٹیک ملتا ہے جبکہ ملاحوں کو بدنما خوراک اور پھپھوندی زدہ شاور ملتے ہیں۔ اعلیٰ حکام کو گرینڈ پیانو ملتے ہیں جبکہ آپ کو ویتنام جنگ کے بعد کی طویل ترین ’’کیریئر تعیناتی‘‘ ملتی ہے۔

مَلاحوں کو دی جانے والی بدبودار اور ناقص خوراک کی خبریں سُرخیوں میں جگہ پاتی ہیں لیکن ایک طویل المدتی

حقیقت یہ بھی ہے کہ کسی بھی وقت تقریباً ایک چوتھائی عسکری خاندان خوراک کے بحران کا شکار ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف اس ایک پیانو کی قیمت اتنی ہے جو زیادہ تر فعال ڈیوٹی پر مامور فوجی اہلکار ایک سال میں کماتے ہیں۔ ۲۰۲۴ء میں فعال ڈیوٹی پر موجود ۱۷ فیصد سے زیادہ فوجی E1 سے E6 تک کے پے گریڈ میں شامل تھے۔ نچلے درجے پر E1 رینک کے ایک نئے بھرتی ہونے والے سپاہی کی بنیادی سالانہ آمدن ۲۵۲۹۷ ڈالر ہوتی ہے جو ایئر فورس کے چیف آف اسٹاف کو تحفے میں دیے گئے پیانو کی قیمت کا تقریباً ایک چوتھائی ہے۔ جبکہ آٹھ سالہ سروس والے E6 رینک کے سپاہی کی سالانہ آمدن ۵۳۳۲۶ ڈالر ہوتی ہے جو پیانو کی قیمت کے نصف سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

یہ تو اُن لوگوں کا حال ہے جو کُل وقتی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس تنازع میں مارے جانے والے پہلے ۶؍امریکی فوجی (جو کویت میں ایک بیس پر ڈرون حملے کا شکار ہوئے) آرمی ریزروسٹ تھے یعنی وہ جُز وقتی عسکری خدمات انجام دے رہے تھے۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی اور کام بھی کرتے ہوں۔ اُن کے رینک کے بارے میں دستیاب معلومات کی بنیاد پر کویت میں ہلاک ہونے والے ان ۶ ریزروسٹوں کی سالانہ بنیادی آمدن ۵۸۰۰ ڈالر سے ۱۶۴۰۰؍ڈالر کے درمیان رہی ہوگی۔

کویت حملے میں بچ جانے والے ایک سپاہی سارجنٹ فرسٹ کلاس کوری ہکس نے ایک مقامی خبر رساں ادارے کو بتایا کہ اس ملک میں تعیناتیوں کو مذاق میں ’’تعطیلات‘‘ (Vacations) کہا جاتا تھا کیونکہ کویت میں ۳۰ سال سے زیادہ عرصے سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ آپ جانتے ہیں ہم سوچتے تھے ہم محفوظ ہیں۔‘‘ کوری ہیکس کے چہرے کے اعصاب کو نقصان پہنچا ہے جس کی وجہ سے اُس کے لیے مسکرانا بھی مشکل ہوگیا ہے۔

رواں برس مارچ میں عراق میں ایندھن بھرنے والا ایک فضائی ٹینکر تباہ ہوا تو ۶؍افراد ہلاک ہوئے۔ اِن میں تین اوہایو ایئر نیشنل گارڈ کے ارکان تھے۔ وہ بھی غالباً جُز وقتی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس جہاز میں ممکنہ طور پر پیراشوٹ نہیں تھے کیونکہ ایئر فورس نے ۲۰۰۸ء میں اخراجات کم کرنے کے لیے اپنے ایندھن والے ٹینکروں کے بیڑے سے پیراشوٹ ہٹا دیے تھے!

یہ رجحان اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کون لوگ زخمی ہو رہے ہیں۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ’’آپریشن ایپک فیوری‘‘ کے نتیجے میں زخمی ہونے والے امریکی فوجیوں کی تعداد تقریباً ۸۰۰ تک پہنچ گئی ہے اور پینٹاگون کی جانب سے ہلاکتوں کی فہرست کا طریقہ بدلنے سے پہلے اِن میں سے نصف ریزروسٹ تھے یا نیشنل گارڈ فورسز سے تعلق رکھتے تھے۔ پینٹاگون نے بارہا کہا ہے کہ زیادہ تر زخم معمولی نوعیت کے ہیں لیکن زخمیوں کی کل تعداد اور معمولی قرار دیے جانے والے زخموں کی نوعیت دونوں پر سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

یہ وہی پینٹاگون ہے جس نے دعویٰ کیا تھا کہ این ایس اے بحرین اور دیگر بیسز کو معمولی نقصان پہنچا ہے اور پھر خاموشی سے تمام لوگوں کو وہاں سے منتقل کر دیا کیونکہ ’نیویارک ٹائمز‘ کی رپورٹ کے مطابق وہ بیسز تقریباً ناقابلِ رہائش ہوچکے تھے۔ ایسے میں سوال یہ ہے کہ پینٹاگون کی باتوں پر کس حد تک بھروسا کیا جائے۔

اگر جنگ شدت اختیار کرتی ہے تو اب تک کا امریکی نقصان شاید بہت چھوٹا دکھائی دینے لگے۔ پینٹاگون کی جانب سے ایران کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے فضائی دفاعی حصار اِس لیے اتنی تیزی سے ختم کر دیے کہ اب دفاعی حکام جان بوجھ کر کچھ میزائلوں اور ڈرونز کو دفاعی حصار سے گزرنے دے رہے ہیں۔ وہ قسم کھاتے ہیں کہ فضائی دفاع کی یہ راشن بندی فوجیوں کی زندگیوں کو خطرے میں نہیں ڈالتی لیکن پھر سوال وہی ہے کہ اِس بات پر کس حد تک بھروسا کیا جائے۔ اسلحہ و گولا بارود کے ذخائر رفتہ رفتہ ختم ہوتے جائیں گے۔ یہ صورتِ حال کب تک برقرار رہ سکتی ہے؟ جس امریکی صدر نے یہ جُوا کھیلا ہے وہ بس یہ دعویٰ کرتا ہے کہ امریکا لڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنی بات سے اختلاف کرنے والے کسی بھی شخص کو یہ امریکی صدر جیل میں ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسے میں آپ ہی سوچیے کہ آپ کو امریکی صدر کے الفاظ پر کس حد تک یقین ہوسکتا ہے۔

ایران کے خلاف چھیڑی جانے والی جنگ آپ کے خاندان سمیت ملک بھر میں سبھی کو نقصان پہنچانے کا سبب بن رہی ہے۔ اب انتظامیہ دفاعی بجٹ کے لیے ڈیڑھ ہزار ارب ڈالر کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس بات کو چھوڑ بھی دیں کہ ذمہ دارانہ اخراجات کے لیے پینٹاگون پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ۱۹۹۰ء کے بعد سے ایک بھی امریکی فوج کے حسابات کا آڈٹ نہیں کرایا گیا ہے۔ یہ فنڈز سوشل ویلفیئر کے اخراجات میں کٹوتی کرکے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یاد رہے کہ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے حال ہی میں کہا ہے کہ ہم جنگیں لڑ رہے ہیں، اس لیے ہمارے لیے ڈے کیئر، میڈیکیڈ، میڈیکیئر۔۔۔ ان تمام انفرادی معاملات کا خیال رکھنا ممکن نہیں ہے۔

سچ ہے کہ مجوزہ بجٹ میں نچلے درجے کے فوجیوں کے لیے تنخواہوں میں نمایاں اضافے کا مطالبہ کیا گیا ہے لیکن پینٹاگون کو اُمید ہے کہ فوجیوں کو معاوضے میں معمولی اضافہ دینے سے ان کے خاندانوں اور گھروں میں موجود دیگر شہریوں کو پہنچنے والے معاشی نقصان کا اثر کچھ کم ہوجائے گا۔

انتظامیہ دفاع پر اور امیر ترین امریکیوں کے لیے ٹیکس میں چُھوٹ پر پیسہ خرچ کر رہی ہے، اِس لیے وہ عام گھرانوں سے سرکاری اخراجات میں کمی کے بوجھ کو برداشت کرنے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اِس میں فوڈ اسٹیمپ حاصل کرنے والے ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ امریکی شامل ہیں (جن میں ہزاروں عسکری خاندان بھی شامل ہیں) اور وہ لاکھوں افراد بھی جو ہیلتھ انشورنس کی استطاعت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ سوشل سکیورٹی سے متعلق مَدوں میں بہت زیادہ کٹوتی کی جارہی ہے۔ معاملہ یہاں تک رُکنے والا نہیں۔ جنگ سے شروع ہونے والا سپلائی چین کا جھٹکا قیمتوں میں اضافہ کرے گا۔ صرف پٹرول نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ مہنگا ہوگا۔ کھانے پینے کی اشیا بھی مہنگی ہوں گی اور دیگر ضروریاتِ زندگی بھی۔

امریکا میں اب تک جنگ کے معاشی اثرات نسبتاً مدھم رہے ہیں لیکن اِس صورتِ حال کے برقرار رہنے کے امکانات کم ہیں۔ افراطِ زر (مہنگائی) مختلف عوامل کے غیر معمولی امتزاج کی بدولت کنٹرول میں رہا ہے۔ تیل کی وافر فراہمی، مختلف ممالک کی جانب سے توانائی کے ذخائر میں اضافہ اور چین کی جانب سے تیل کی درآمدات میں کمی بھی اِن عوامل میں شامل ہیں۔ آبنائے ہرمز کی بندش سے زائد سپلائی اور ذخائر پہلے ہی کافی حد تک کم ہوچکے ہیں جس کا مطلب ہے کہ چین دفاع کی آخری لائنوں میں سے ایک ہے اور اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ وہ طویل عرصے تک اپنے ذخائر پر انحصار جاری نہیں رکھنا چاہے گا۔ معاملات الجھتے جارہے ہیں۔ قیمتوں میں اضافے کو روکنے والے حالات کسی بھی وقت یا بہت جلد ختم ہوسکتے ہیں۔

امریکیوں کو جن معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اُن میں پہلے نمبر پر وہ مشکلات ہیں جو ایران سے جنگ کے باعث پیدا ہو رہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دہشت گردی اور سائبر حملوں کا خطرہ بھی بڑھ گیا ہے۔ امریکا میں حال ہی میں پانی کی بہت سی تنصیبات پر حملے ہوئے ہیں۔ اِن سائبر حملوں

کوایران جنگ سے متعلق معاملات سے جوڑا جا رہا ہے۔

ایران اور امریکا کے درمیان ایک زمانے سے کشیدگی چل رہی ہے۔ معاملات کبھی پیچیدہ ہو جاتے تھے اور کبھی درستی کی راہ پر گامزن ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ اِس جنگ سے قبل ایران کے پاس امریکا میں کسی بھی نوعیت کے حملے کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اب ایران کی بقا کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ایرانی قیادت کو نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ اُس کے بنیادی ڈھانچے کو بھی شدید خطرات لاحق ہیں۔ اگر ایران اب غیر متناسب حربے استعمال کر رہا ہے تو اُس کے پاس ایسا کرنے کا بھرپور جواز موجود ہے۔ مزید برآں، ایران سے کم تعلق رکھنے والے عناصر بھی اُس کی آڑ میں کسی واردات کے لیے نیا جواز ڈھونڈ سکتے ہیں۔

دہشت گردی کوئی یقینی امر نہیں مگر خیر، اِس معاملے کو غیر سنجیدگی سے نظرانداز نہیں کر دینا چاہیے۔ شہری آزادیوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے کہ جنگ سے پہلے کے مقابلے میں اب امریکا کے خلاف دہشت گردی کا خطرہ زیادہ اور قوی ہے۔ اگر ایران کے خلاف امریکی جنگ مزید زور پکڑتی ہے تو امریکی سرزمین پر دہشت گردی کا خطرہ مزید قوت پکڑے گا۔ اگر ایسے میں امریکیوں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوا یا اُنہیں جانی نقصان پہنچا تو ذمہ دار کون ہوگا؟

ٹرمپ انتظامیہ امریکیوں کی زندگی کو تحفظ فراہم کرنے کے حوالے کتنی سنجیدہ اور committed ہے اِس کا نمونہ چند ماہ قبل مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں امریکی فوجی اڈوں اور دیگر تنصیبات پر حملوں کی صورت میں دیکھا جا چکا ہے۔ مہینوں کی کشیدگی اور جنگ شروع کرنے کے وقت پر مکمل کنٹرول کے باوجود امریکا نے پہلے حملے شروع ہونے کے بعد ہی عسکری خاندانوں کو وہاں سے نکالا۔ اس کے برعکس جون ۲۰۲۵ء کی ۱۲؍روزہ جنگ میں ملٹری نے حملے شروع ہونے سے کئی دن پہلے رضا کارانہ انخلا کی سہولت فراہم کی تھی۔ امریکا کے پانچویں بحری بیڑے کے سربراہ نے مارچ ۲۰۲۶ء میں خاندانوں کو بتایا تھا کہ یہ منتقلی مختصر ہونے کی توقع ہے۔ چھ ماہ بعد بھی سیکڑوں افراد عارضی رہائش گاہوں میں پڑے ہیں اور کچھ کا کہنا ہے کہ وہ بنیادی اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنی جیب سے ہزاروں ڈالر خرچ کر چکے ہیں۔

کچھ لوگ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ جب عسکری خاندان بیرونِ ملک رہتے ہیں تو وہ کچھ خطرہ مول لینے پر رضا مند ہوتے ہیں یا یہ کہ آپریشنل سکیورٹی کے لیے تاخیر سے انخلا ضروری تھا اور اس لیے یہ معاہدے کا حصہ تھا۔ یہ درست ہے کہ کسی بھی فوج کا خاندان اگر بیرونِ ملک رہائش کے لیے آمادہ ہوتا ہے تو لازم ہے کہ وہ کسی بھی پریشان کن صورتِ حال کا سامنا کرنے پر زیادہ شکوہ نہ کرے تاہم اُس کا تحفظ یقینی بنانا بھی تو امریکی حکومت ہی کا کام ہے۔

خدمت کا بہتر طریقہ

اگر آپ بنیادی طور پر امریکا سے محبت کے نام پر فوج میں بھرتی ہوئے تھے تو آپ ایک اور تباہ کن جنگ کے خلاف مزاحمت کر کے وطن کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ یہ جنگ امریکا اور مشرقِ وسطیٰ دونوں کو بدتر حالت میں چھوڑے گی۔ یہ جنگ قابلِ بحث حد تک غیر قانونی ہے اور اگرچہ سپاہی شاذ و نادر ہی قانونی سوالات اٹھانے کے معاملے میں خود کو مجاز محسوس کرتے ہیں غیر قانونی جنگ لڑنے سے انکار گناہ ہے نہ جرم اور اُس سے ندامت محسوس نہیں کرنی چاہیے۔

اگر کسی نے امریکی فوج میں شمولیت اِس لیے اختیار کی تھی کہ وہ دنیا کو محفوظ تر بنانے کا عزم رکھتا تھا تو یاد رہنا چاہیے کہ ایران پر بم اور میزائل برسانا اِس مقصد کے بالکل منافی ہے۔ فوری علاقائی تناؤ کو ایک طرف رکھتے ہوئے بھی دیکھیے تو یہ اقوامِ متحدہ کے منشور کی بھی صریح اور کُھلی خلاف ورزی ہے۔ علاقائی کشیدگی اور کثیر القطبی دنیا کے اُبھرنے کے نتیجے میں بین الاقوامی قانون کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

اگر کوئی شخص امریکی فوج میں محض اس لیے بھرتی ہوا ہے کہ زیادہ سے زیادہ افرادی مالی استحکام یقینی بنایا جائے یا ایک بھرپور کیریئر پروان چڑھایا جائے تو اُسے سوچنا چاہیے کہ کیا ایسا کرنا اُس ہلاکت یا معذوری کا نعم البدل ہے جو واقع ہو سکتی ہے۔

پینٹا گون کے منصوبہ سازوں کے لیے سب سے واضح اشارہ ’’ضمیر کی بنیاد پر اعتراض‘‘ (Conscientious Objection) ہے۔ حقیقت پسندانہ طور پر، فوجیوں کی صرف ایک چھوٹی سی تعداد اس راستے کو اپنائے گی مگر خیر، پینٹا گون کے اعلیٰ ترین حکام اِس تبدیلی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

’’ضمیر کی بنیاد پر اعتراض‘‘ کے لیے ایک اعلیٰ معیار کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ اعتراض کرنے والے کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ جنگ کو فی نفسہٖ بُرا تصور کرتا ہے اور وہ کسی خاص جنگ کا مخالف نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر وہ جنگوں ہی کے خلاف ہے۔ کہ ایسا ہی ہو، جب تک کہ اخلاقی عقیدہ مذہبی عقیدے جتنا ہی وزن رکھتا ہو۔ اس سلسلے میں ’’سینٹر آن کانشینس اینڈ وار‘‘ سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

کسی بھی فوجی کے لیے اپنے ضمیر کی آواز پر متوجہ ہوتے ہوئے کسی بھی جنگ میں لڑنے سے انکار یا اعتراض کوئی آسان معاملہ نہیں ہوتا۔ بہت سے فوجی کسی بھی جنگ کو بلاجواز اور غیر منطقی سمجھنے کے باوجود اُس کے خلاف آواز اٹھانے سے ڈرتے ہیں کیونکہ فوج کا اندرونی نظم و ضبط اِس کی اجازت نہیں دیتا اور متعلقہ فوجی کے خلاف تادیبی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اُس کا گریڈ بڑھانے سے انکار کیا جائے یا اُس کی مراعات میں کمی کر دی جائے۔ ایسی صورت میں متعلقہ فوجی کا مستقبل غیر یقینی ہو جاتا ہے اور اُسے معاوضہ بھی اِتنا نہیں مل پاتا کہ نئے سِرے سے زندگی شروع کرے۔ اس کیفیت کو صرف فوجی ہی سمجھ سکتا ہے، اُس کے گھر والے نہیں۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ موجودہ حکومت یعنی ٹرمپ انتظامیہ اختلافِ رائے دکھانے والوں کے خلاف معاندانہ جذبات رکھتی ہے۔

کسی بھی ملک کی فوج چند بنیادی اصولوں کے تحت کام کرتی ہے۔ امریکی فوج بھی اِس معاملے میں انوکھی نہیں۔ اگر آپ بے بنیاد اور بلاجواز جنگوں کو پسند نہیں کرتے تو تماشائی نہ بنیں بلکہ اپنے ساتھیوں کی بھی حوصلہ افزائی کریں جو ہر حال میں غیر مشروط اطاعات کے ماحول کو بدلنا چاہتے ہیں۔ بہت سے فوجی کسی جواز اور مقصد کے بغیر لڑی جانے والی جنگ کا ایندھن نہیں بننا چاہتے مگر کچھ کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ایسا ماحول پیدا کیا جانا چاہیے جس میں لوگ اپنی رائے کُھل کر بیان کریں۔

ایک اور طریقہ یہ ہے کہ اپنے سروس کانٹریکٹ کو تجدید کیے بغیر ختم ہونے دیجیے۔

اگر عسکری منصوبہ ساز فوج سے نکلنے والوں کی تعداد میں اضافے کو دیکھیں گے تو اپنی پالیسی پر نظر ثانی ضرور کریں گے۔

آپ صحافیوں سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ بس اِتنا ہے کہ محفوظ طریقے سے ایسا کیجیے۔ امریکا کی حدود میں خدمات انجام دینے والے فوجیوں کو کچھ اندازہ نہیں کہ بیرونِ ملک تعینات کیے جانے والے فوجی کس کرب سے دوچار ہیں۔

کوئی بھی شخص اپنے وطن کی سلامتی یقینی بنانے کی خاطر فوج میں بھرتی ہوتا ہے۔ وطن کے لیے لڑنا بہت بڑی خدمت اور سعادت ہے مگر صرف اُس وقت جب مقصد جائز ہو، سَر کٹانے سے وطن کو کچھ ملتا ہو۔ اِس وقت امریکی فوجیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ دِلیرانہ کام جنگ سے انکار ہے۔

(مترجم: ابوصباحت)

"Service members should refuse to fight Trump’s illegal wars".
("currentaffairs.org". Sep 17, 2026)

اب پیوٹن کیا کریں گے؟

Jacques Lafitte

روس کے صدر ولادیمیر پیوٹن کی حکمتِ عملی کے سنجیدہ تجزیہ کار حال ہی میں سی آئی اے کے سربراہ جان ریٹکلف کے ماسکو کے غیرمتوقع دورے کے اسباب اور نتائج پر غور کر رہے ہیں۔ اگست کے آخر میں ہونے والے اِس دورے کے بعد اب بہت سے لوگوں کو یقین ہو چلا ہے کہ روس جلد ہی بالٹک ممالک پر حملے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

ماسکو میں ریٹکلف کی ملاقات کس سے ہوئی، یہ راز کیوں ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ ریٹکلف نے خود پیوٹن سے ملاقات کی، گوکہ روسی میڈیا نے اِس کا اعتراف کرنے سے گریز کیا ہے۔ پرانے سوویت دور کی کریملنولوجی کی طرح ایک سرکاری پُراسراریت برقرار ہے لیکن اِس پہیلی کو حل کیا جاسکتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ریٹکلف صرف اپنے ہم منصب روس کی فارن انٹیلی جنس سروس (SVR) کے سربراہ سرگئی ناریشکن سے ملے ہوتے، جیسا کہ بعض روسی میڈیا کا دعویٰ ہے، تو وہ SVR کے ہیڈکوارٹرز جاتے جو ماسکو کے جنوب مغرب میں کافی دُور واقع ہے۔ اِسی طرح اگر دیگر روسی میڈیا ذرائع کے مطابق ریٹکلف فیڈرل سکیورٹی سروس (FSB) کے سربراہ الیگزینڈر بورتنیکوف سے ملنے آئے ہوتے (جو کہ KGB کی جانشین تنظیم ہے) تو وہ غالباً بدنامِ زمانہ ’’لوبینکا‘‘ جاتے جو ۱۹۱۷ء سے تمام سوویت اور پھر روسی سیاسی پولیس فورسز کا ہیڈکوارٹرز رہا ہے۔ ریٹکلف کریملن گئے اور پیوٹن نے اُس دن ایک اہم ملاقات منسوخ کردی۔

یوکرین پر تھوپی جانے والی جنگ اب روس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے اور دن بہ دن خود اُسی کے خلاف ہوتی جارہی ہے۔ روس بہت سے معاملات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کررہا ہے مگر اب معاملہ اِتنا خراب ہو چکا ہے کہ روسی پروپیگنڈا مشین ماسکو میں ریٹکلف کی ملاقاتوں پر بھی یکساں موقف برقرار نہیں رکھ سکی۔ سیدھی سی بات ہے، کچھ اہم چھپایا جارہا ہے۔ یوکرین میں جنگ پیوٹن کے لیے انتہائی پریشان کن ہوتی جارہی ہے، بالخصوص فوجی محاذ پر۔ روسی فوج کو صرف جولائی اور اگست کے دوران بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اِن دو ماہ میں ہلاک وزخمی ہونے والوں کی تعداد ۸۰ ہزار سے زائد رہی۔ رضاکاروں کی بھرتی کا عمل ختم ہونے کے بعد یوکرین کی زمین پر موجود روسی فوج سے وابستہ افراد کی تعداد ۲۰۲۶ء کے آغاز میں ساڑھے سات لاکھ سے گھٹ کر سات لاکھ سے بھی کم رہ گئی ہے۔

اگست میں روسی فوج کو ڈنیپروپیٹرووسک اوبلاست (صوبے) سے مکمل طور پر نکال باہر کیا گیا تھا اور یہ کئی دوسرے مقامات پر بھی بیک فُٹ پر ہے۔ ڈونباس کے شہر لیمان پر بھی روس کا قبضہ ختم ہوا۔ چند ماہ قبل تک یہ سمجھا جارہا تھا کہ یہ شہر اب یوکرین کے ہاتھ سے مکمل طور پر نکل چکا ہے۔

پیوٹن کی خیالی دنیا

روسی صدر ایک خیالی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ بار بار یہ کہنا پسند کرتے ہیں کہ روس دنیا کی چوتھی بڑی معیشت ہے۔ اُنہیں اِس بات کا شدت سے احساس ہونا چاہیے کہ روس میں تیل صاف کرنے کے کارخانوں اور لاجسٹکس سینٹرز سے دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ صدر پیوٹن کو اندازہ ہونا چاہیے کہ اُن کی مقبولیت میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے۔ اُن کی حمایت کرنے والوں کا گراف گرتا جارہا ہے۔ روسی جرنیلوں کے بڑھتے ہوئے مضحکہ خیز جھوٹ کے باوجود صدر پیوٹن کو یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ابھی تک گرمیوں کا اپنا کم ازکم ہدف بھی حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ پیوٹن نے طے کیا تھا کہ کراماطورسک اور سلوویَنسک کے شہروں کے گرد ’’ڈونباس‘‘ کے قلعے کو فتح کرنا تھا۔ سہولت کی خاطر یہ ہدف اب پورے ملک پر محیط کردیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جلد ہی اگلے سال موسمِ بہار کے حملے کے لیے بھی ہدف بن جائے۔

صدر پیوٹن اور حکومت کے تمام اعلیٰ عہدیداروں کے لیے شکست اب بھی ناقابلِ تصور بات ہے جبکہ معاملات اُسی طرف جارہے ہیں۔ درحقیقت اِس معاملے میں صدر پیوٹن کی حکومت مونٹی پائتھنز فلائنگ سرکس (مزاحیہ شو) سے مشابہت رکھتی ہے۔ فرق، بس یہ ہے کہ یہ شو اِس قدر مزاحیہ نہیں! رُوسی صدر کو رفتار بڑھانے کی ضرورت ہے اور یہ بات وہ بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

شنگھائی تعاون تنظیم (SCO) کے ارکان کا کہنا ہے کہ روس نے دو سال پہلے یوکرین کی جانب سے کورسک اوبلاست کے ایک حصے پر قبضے کے وقت ٹیکٹیکل نیوکز استعمال نہیں کیے تھے۔ صدر پیوٹن نے شمالی کوریا میں اپنے دوست کم جونگ اُن سے مدد مانگی۔ روسی پروپیگنڈا ہمیں چاہے جو بھی باور کروانا چاہے، نیوکز یعنی ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کا آپشن اب قابلِ اعتماد نہیں رہا۔ کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کا بڑے پیمانے پر استعمال بھی ایسا نہیں جس پر زیادہ بھروسا کیا جاسکے۔ دِمتری میدویدیف کی طرف سے کثرت سے پیش کیے جانے والے پیوٹن کے کسی بھی تباہ کن (قیامت خیز) آپشن کے استعمال کا امکان اب اس لیے اور بھی کم ہے۔

کچھ دن قبل بشکیک میں شنگھائی تعاون تنظیم (SCO) کے سربراہ اجلاس میں چین کے شی جن پنگ، بھارت کے نریندر مودی اور قازقستان کے قاسم جومارت توکایف نے پیوٹن سے اعلانیہ کہا کہ اُنہیں اپنی جنگ ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

صدر پیوٹن کے باقی ماندہ تین آپشنز

اب روس کے پاس تین آپشن بچے ہیں: یوکرینی شہریوں پر مزید حملے، مغربی یورپ کے خلاف مزید جارحانہ ہائبرڈ جنگ (جیسا کہ جرمن اب تقریباً ہر روز اپنی سرزمین پر دیکھ رہے ہیں) اور بڑے پیمانے پر فوجیوں کی نقل وحرکت۔ تیسرا آپشن واحد راستہ ہے جو میدانِ جنگ میں حقیقی تبدیلی لاسکتا ہے۔ یوکرین کے شہری اس ناخوشگوار پیشرفت کو واقع ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ صدر ولودومیر زیلنسکی دشمن کی طرف سے ۶ لاکھ افراد کی عمومی نقل وحرکت کے بارے میں خبردار کر رہے ہیں۔ مغربی تجزیہ کار یہ تعداد ۲ سے ۵ لاکھ کے درمیان بتا رہے ہیں۔

۱۹۱۷ء یا ۱۹۹۱ء کا اعادہ؟

سبھی اس نکتے سے متفق ہیں کہ حقیقی تبدیلی لانے کی کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے اِس پیمانے پر دباؤ یا جبری بھرتی کی ضرورت ہے جو روسی معاشرے کی طرف سے شدید ردِعمل کا باعث بن سکتی ہے۔ اور پیوٹن کو ۱۹۱۷ء (زارشاہی روس کے خاتمے) یا ۱۹۱۷ء (جس کے نتیجے میں سوویت یونین کا خاتمہ ہوا) کے دُہرائے جانے کے امکان سے زیادہ کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ بھرتی اور تحرک بھی فوری چاہیے۔ اگست میں ۲۰ سے ۵۰ سال کی عمر کے ایک لاکھ ۳۰ ہزار افراد سرحد پار کرکے جارجیا چلے گئے۔ نہ تو روسی معیشت اور نہ ہی روسی پروپیگنڈا دماغی اور افرادی قوت کے ایک اور فرار کا متحمل ہوسکتا ہے۔

خفیہ نقل و حرکت؟

اگر صدر پیوٹن چاہتے ہیں کہ بڑے پیمانے پر فوجی نقل و حرکت ہونی چاہیے تو اُنہیں اِس کا معقول جواز بھی پیش کرنا ہوگا۔ یا کم از کم اِسے جائز قرار دینا چاہیے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ روس کی حقیقی سلامتی یقینی بنانے کے لیے ایسا کرنا لازم ہے۔ اس اقدام کو جو چیز پیچیدہ بناتی ہے، وہ یہ ہے کہ حکومت نقل و حرکت کے ارادے سے بھی انکار کرتی ہے۔

ہم فروری ۲۰۲۲ء میں نہیں جی رہے۔ ۲۳ فروری ۲۰۲۲ء تک صدر پیوٹن عالمی سطح پر مغربی میڈیا کی طرف سے کیے جانے والے انتباہ کے باوجود یہی کہا کرتے تھے کہ ہم ایسا کچھ نہیں کر رہے۔ عمومی طور پر روسی اور خصوصاً ماسکو کے رہائشی اب اپنی راتیں تقریباً خالی پٹرول پمپس کے سامنے قطاروں میں یا یوکرینی ڈرونز کا خوفناک شور سُنتے ہوئے گزارتے ہیں۔ جنگ اب اُنہیں بالکل لطف نہیں دیتی۔ ۲۰۲۶ء نقل و حرکت سے متعلق کوئی بھی یوٹرن ساڑھے چار سال پہلے کے مقابلے میں سنبھالنا زیادہ مشکل ہوگا۔

صدر پیوٹن کا بڑے پیمانے کی فوجی نقل و حرکت کا اقدام نیٹو کے حملے پر منحصر ہے۔ اِن تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیوٹن کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے جو اُنہیں نقل و حرکت کو جائز قرار دینے کی اجازت دے سکتا ہے۔۔۔ یہ کہ نیٹو کو روس پر حملہ کرنا ہوگا۔ اور یہاں بالآخر ہم بالٹک ممالک تک پہنچتے ہیں۔ ایک مثالی دنیا میں ہائبرڈ جنگ یہی سب کچھ حاصل کر لیتی مگر روس کی ہائبرڈ جنگ اب ایک رکاوٹ بنتی دکھائی دے رہی ہے۔

نیٹو ممالک کے خلاف پیوٹن کی ہائبرڈ جنگ کوئی خاص اثر نہیں ڈال رہی۔ پیوٹن کی بدقسمتی سے پولینڈ اور رومانیہ میں دھماکے کرنے والے بھاری ڈرونز پورے یورپ میں اسلحے کے ذخائر پر بمباری اور جرمن بجلی گھروں پر بڑے حملے بھی معاملات کو تبدیل نہیں کر پا رہے۔ یورپی باشندے اب بھی جنگ میں حصہ لینے کا ارادہ نہیں رکھتے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ، جنہوں نے حال ہی میں روس کو ایش ول میں جی۔۲۰ سربراہ اجلاس میں مدعو کیا ہے، دن رات نیٹو سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ ایک اور محاذ پر بھی اپنی توقیر بچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ کسی سخت مغربی ردِعمل کی تجویز دینے والے آخری شخص ہوں گے۔

کریملن چاہتا ہے کہ نیٹو کے صبر کا پیمانہ چھلک جائے۔ کریملن کے نقطۂ نظر کے مطابق نیٹو کی قوتِ برداشت کی حد مایوس کن حد تک بلند ہے لیکن وہ حد موجود ہے اور یہ شاید وہی بات ہے جس کی ریٹکلف نے ۲۵/اگست کو تصدیق کی تھی۔ پیوٹن بہت حد تک دیوار سے لگ چکے ہیں۔ اب اُنہیں اپنی بگڑی ہوئی ساکھ بحال کرنے خطرہ مول لینا ہوگا۔ لازم ہے کہ صدر پیوٹن اب نیٹو کو اچھوتے انداز سے مشتعل کریں۔ اُنہیں نیٹو کے علاقے یا علاقوں پر حملہ کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی پورے ملک پر حملہ نہیں کریں گے کیونکہ فی الحال ایسا کرنے کی گنجائش نہیں۔ ہاں، کسی ملک کے کونے پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔

بالٹک ''فاشسٹوں'' کی من گھڑت کہانی

منصوبہ سادہ ہے۔۔۔ یوکرین کے جواز والی حکمتِ عملی کو دُہرانا۔ اس فریم ورک کو استعمال کرتے ہوئے روسی فوج بالٹک کے ''فاشسٹوں'' کے ''مظالم'' سے مقامی روسی بولنے والوں کو بچانے کے لیے ایک پڑوسی ملک پر حملہ کرے گی۔ پیوٹن اگلے ہی دن الحاق (قبضے) کے حکم نامے پر دستخط کر دیں گے اور پھر نقل و حرکت کے حکم نامے کی تیاری کرتے ہوئے سُکون سے نیٹو کے ردِعمل کا انتظار کریں گے۔

بالٹک بساط کی تفہیم

بلاشبہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ نیٹو جوابی حملہ نہ کرے۔ پیوٹن تب ناقابلِ تسخیر روسی فوج کی ایک تاریخی کامیابی کا دعویٰ کریں گے جس سے یوکرین میں جنگ کو فوری طور پر زیادہ مقبول بنانے کا امکان ہے لیکن یہ سب کچھ وسیع پیمانے کی فوجی نقل و حرکت کو حقیقی بنیاد فراہم نہیں کرے گا۔

درمیان کا منظر نامہ

چند ایک باتیں پیوٹن کے حق میں جاتی ہیں۔ اُن کے لیے مثالی منظر نامہ یہ ہے کہ نیٹو میں اس بات پر شدید اختلافات پائے جاتے ہیں کہ روسی حملے کی صورت میں کس نوعیت کے ردِعمل کا اظہار کیا جائے۔ روس کو ایسا حملہ کرنا ہوگا جو بالٹک، فن لینڈ اور پولینڈ کی افواج تک محدود ہو۔ حملے کے لیے صرف تین ''امیدوار'' ہیں۔ سووالکی راہداری (Suwalki corridor) یعنی پولینڈ لِتھوانیا سرحد کا ۸۰ کلومیٹر کا علاقہ جو روس کے زبردستی الگ کیے گئے علاقے کیلنن گراڈ کو بیلا رس سے الگ کرتا ہے، روس کے ساتھ لِٹویا کا سرحدی علاقہ اور ایسٹونیا کا شہر نار وا (Narva)۔

تین غیر مثالی آپشنز

پہلے دو آپشنز میں بڑی خامیاں ہیں۔ سووالکی راہداری بہت دلکش نظر آتی ہے مگر یہ کئی ملکوں کی افواج سے بھری ہوئی ہے۔ کیلنن گراڈ کو اہم لاجسٹک مسائل کا سامنا ہے۔ آخر کار، بیلا رس قابلِ اعتماد نہیں اور ممکنہ الحاق شدہ علاقے کے خد و خال واضح نہیں ہیں۔ جہاں تک لِٹویا کا تعلق ہے، اُس کی مشرقی سرحد جنگلات اور کم آبادی والے دیہی علاقوں پر مشتمل ہے۔

نار وا ہی کیوں؟

بلاشبہ نار وا ایک پُرکشش ہدف ہے۔ اِس شہر کی بلدیاتی حدود واضح ہیں۔ یہ زیادہ بڑا نہیں ہے، اِس کی آبادی صرف ۵۰ ہزار ہے۔ پھر بھی یہ ایسٹونیا کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ یہ خوبصورت اور تاریخی ورثے کا حامل ہے۔ نار وا میں بنیادی طور پر روسی بولنے والی آبادی ہے اور یہ سالوں سے روس سے متاثرہ متعدد اشتعال انگیزیوں کا مرکز رہا ہے۔ یہ روسی سرحد پر واقع ہے جسے نار وا نامی دریا الگ کرتا ہے۔

عملی رُکاوٹیں برقرار ہیں۔ روسی فوجی نقطۂ نظر سے ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ نار وا میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک پُل ہے۔ اور اِس سے پہلے کہ پہلی روسی بکتر بند گاڑی اِسے عبور کرے، ایسٹونیا والے یقیناً اُسے تباہ کر دیں گے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ روس دریا کے اپنے کنارے کو ایک ممکنہ متبادل کے لیے تیار کر رہا ہے۔ اگر اِس تیاری کا کُھل کر ڈھنڈورا پیٹا جاتا تو یہ ایک حواس باختگی کا ڈراما ہو سکتا تھا۔ سب کچھ بہت خاموشی سے ہو رہا ہے J اِس لیے اِسے ایک حقیقی تیاری کے طور پر دیکھنا زیادہ دانش مندانہ ہوگا۔

پیوٹن کے لیے ریٹکلف کا کیا پیغام تھا؟ اگر ریٹکلف نے پیوٹن سے نار وا پر حملہ نہ کرنے کا کہا تھا تو وہ پیوٹن کا ارادہ تبدیل نہیں کر سکے ہوں گے۔ پیوٹن نے ہمیشہ اپنے بُرے ارادوں کے بارے میں ملنے والے ہر انتباہ کو اِس بات کی تصدیق سمجھا ہے کہ وہ حق پر ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ شخصیات کی دیگر منفی خامیوں سے بھی زیادہ اپنے صحیح ہونے کا یقین عمر کے ساتھ اور بڑھتا جاتا ہے، بالخصوص اُس وقت جب مخالفت بہت زیادہ کی جائے۔

نیٹو کے علاقے پر حملے کا منفی پہلو

پیوٹن نیٹو پر حملہ کر کے یوکرین کی جنگ نہیں جیتنے والے۔ اگر نار وا کے خلاف اقدام بغیر کسی بڑے واقعے کے ہو بھی جاتا ہے تب بڑے پیمانے کی فوجی نقل و حرکت ایک تباہ کن آئیڈیا ہے۔ یہ اقدام لاکھوں غیر متحرک اور بے دِلی میں گرفتار روسیوں کو یقیناً موت کے منہ میں دھکیل دے گا۔ جنگ میں لڑنے کے لیے جو لوگ متحرک تھے J وہ گزشتہ چار سال کی جنگ کے دوران تدریجی طور پر ختم ہو چکے ہیں۔ مزید ناقص

\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۶ /////

زوال پذیر مغرب

Owen Jones

ایک زمانے سے ہم سُنتے آرہے تھے کہ مغرب زوال پذیر ہے۔ اب واقعی ایسا لگتا ہے کہ مغرب بہت تیزی سے نیچے آرہا ہے۔ انگریزی میں کہیں تو فری فال ہو رہا ہے اور سب سے بُری بات یہ ہے کہ ہمیں خبردار کیا گیا تھا لیکن ہم نے کان نہ دھرنے کا فیصلہ کیا۔

مغربی رہنماؤں کی دولت اور اقتدار کی لامتناہی ہوس ہمیں یہاں تک لے آئی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے، اُس کے بارے میں بہت سے لوگوں کو معلوم تھا مگر اُنہوں نے تدارک کے لیے کچھ نہ کیا۔

زوال کی علامتیں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ حال ہی میں جرمنی کی انتہائی دائیں بازو کی جماعت نے ایک اور ریاستی الیکشن جیت لیا۔ اُس نے میکلنبرگ۔ ویسٹرن پومرانیا میں تقریباً ۴۰ فیصد ووٹ حاصل کیے۔ فرانس ۵۴؍ارب یورو کی مالیاتی کٹوتی کی تیاری کر رہا ہے جو نام نہاد اور ڈگمگاتے ہوئے یورپی سماجی ماڈل پر مزید شکنجہ کَس سکتی ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک بار پھر ایران کو ”ملیا میٹ“ کرنے کی دھمکی دی حالانکہ اس صدی میں کسی مسلم ملک کے خلاف چوتھی ناکام مغربی جنگ نے امریکیوں کے ایندھن کے بلوں میں ۱۰۰؍ارب ڈالر سے زیادہ کا اضافہ کیا ہے۔

مغرب کے زوال اور ناکامی سے متعلق علامات پر تو زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ہمارے دور کی اصل لڑائی اس کی تشخیص پر ہے اور دائیں بازو کے لوگ کئی سال سے اس معاملے میں کامیابی سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔ اُن کا بیانیہ سادہ ہے اور، جیسا کہ تازہ ترین جرمن ریاستی الیکشن نے واضح کیا، موثر بھی ہے: مغرب پناہ گزینوں، مسلمانوں، ٹرانس جینڈر ”ووک“ (woke) کلچر اور ”ڈیپ اسٹیٹ“ کے ہاتھوں مر رہا ہے۔ جب میں نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ میں ”مغرب کا زوال: انہوں نے اِسے اصل میں کیسے کھویا“ (The Fall of the West: How They Really Lost It) کے زیرِ عنوان کتاب لکھ رہا ہوں تو وہ پریشان ہو گئے کہ کہیں میں لِز ٹرس (Liz Truss) کا روپ دھار چکا ہوں جنہوں نے بہت تیزی سے ”مغرب کو بچانے کے لیے دس سال“ (Ten Years to Save the West) نامی کتاب لکھی تھی۔

میری تشخیص کچھ مختلف ہے۔ مغرب زوال پذیر ہے کیونکہ سرد جنگ کے بعد اس کے حکمران طبقے نے ایسی فتح کا اعلان کیا جس سے وہ کبھی سنبھل ہی نہیں پائے۔ انہوں نے ایک ایسے معاشی ماڈل کو ناقابلِ تردید مستقبل قرار دے کر آگے بڑھایا جو دولت کو اوپر کی طرف کھینچتا تھا جبکہ ایک بظاہر ناقابلِ تسخیر فوج کو مسلم دنیا کی تشکیلِ نو کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ یہ دونوں نظریات ان لوگوں کے لیے انتہائی پُرکشش تھے جنہوں نے اِن سے فائدہ اٹھایا۔ اس کا نتیجہ تباہ کن نکلا ہے۔ مغربی معیشت عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے اور سرکاری شعبے کی طرف سے فراہم کی جانے والی خدمات بہتر بنانے میں ناکام رہی ہے۔ مغربی افواج کو کابل، بغداد، طرابلس اور آبنائے ہرمز میں ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

بیرونی دنیا میں اخلاقی برتری کے مغربی دعوے خاکستر ہو چکے ہیں، جن میں غزہ میں فلسطینی عوام کی اسرائیل کے ہاتھوں نسل کشی کا بھی اہم حصہ ہے۔ اور اپنے گھر میں ایک دوسرے میں پیوست تباہیوں سے پیدا ہونے والی مایوسی نے انتہائی دائیں بازو کے عروج کی راہ ہموار کی ہے جو خود جمہوریت کے لیے اب ایک بہت بڑا خطرہ بن چکا ہے۔

اپنی کتاب کے لیے کی جانے والی تحقیق کے دوران جس بات نے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا، وہ یہ تھی کہ جو کچھ ہونے والا تھا وہ بہت سے لوگوں نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا اور خبردار بھی کیا تھا مگر اُن کا انتباہ بُری طرح نظر انداز کر دیا گیا۔

۱۹۹۴ء کے موسمِ بہار میں ماسکو میں امریکی سفارت خانے کے ایک سینئر سیاسی افسر نے واشنگٹن کو ایک طویل اختلافی کیبل بھیجا۔ اس کا موقف اتنا واضح تھا کہ اُس کے مصنف کو خارجہ پالیسی کے حلقوں میں ایک الگ تھلگ فرد بنا دیا گیا۔

روس پر مغرب نواز عناصر کی حکومت تھی لیکن میری کی کیبل نے خبردار کیا کہ ”روس میں جمہوری قوتیں شدید خطرے میں ہیں“ اور ”اس بات کا کوئی جواز نہیں ہے کہ روسی معیشت تیز رفتار مارکیٹ اصلاحات کی صلاحیت رکھتی ہے۔“ انہوں نے پیش گوئی کی کہ اگر امریکا نے حقیقی شراکت کے بجائے معاشی مبلغ کا کردار منتخب کیا تو اس سے انتہا پسندوں کو تقویت ملے گی اور روس اور مغرب کے درمیان مخاصمانہ تعلقات کو نئی زندگی مل جائے گی۔

وائن میری نے مجھے بتایا کہ ہم محنت کشوں کے معیارِ زندگی کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور پھر بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ لوگ ہمیں ووٹ دیں۔ واشنگٹن کا جواب یہ تھا کہ انہیں ناپسندیدہ شخصیت (persona non grata) قرار دے دیا جائے۔ یہ کیبل تین دہائیوں تک خفیہ رہا اور چپکے سے صرف ۲۰۲۴ء کے آخر میں جاری کیا گیا۔ اس وقت تک، ایک تخمینے کے مطابق، اس منتقلی کے دوران روس میں لاکھوں اضافی اموات ہو چکی تھیں۔ اس دوران اِن کھنڈرات سے ابھرنے والا طاقتور حکمران یوکرین پر اپنی خونی اور بھرپور یلغار کے تقریباً تین سال پورے کر چکا تھا۔

جن لوگوں نے وائن میری کی بات کو نظر انداز کیا، وہ اپنے مفروضوں کے بارے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں رکھتے تھے۔ صدر بل کلنٹن کے روسی امور کے مشیر اسٹروب ٹالبوٹ (Strobe Talbott) نے کہا تھا ”روس کو ہمارے طور طریقے اپنانے چاہئیں۔ ہم منفرد ہیں، یکتا ہیں۔ کوئی ہم سا نہیں۔ اگر کسی کو یہ بات بُری لگتی ہے تو لگتی رہے۔ یہ ہم ہیں۔ یہ امریکا ہے۔“

سرد جنگ کے بعد کے نظام کا بنیادی مسئلہ یہی تھا۔ یہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ انتباہ کی پشت پر چاہے جتنے بھی مضبوط شواہد ہوں، جب وہ مغربی طاقت کے مفادات سے ٹکراتے تو انتباہ پس منظر میں چلا جاتا تھا۔

میں نے اس کتاب کے لیے بغداد سے پٹسبرگ اور نیروبی سے رام اللہ تک دو سال سفر کیا اور وائن میری کا تجربہ استثنا کے بجائے قاعدہ ثابت ہوا۔ ۲۰۰۵ء کے ایک انٹرویو میں امریکی ایلچی ایڈمنڈ میک ولیمز (Edmund McWilliams) نے کہا کہ انہوں نے ۱۹۸۸ء میں خبردار کیا تھا کہ واشنگٹن کی افغان پالیسی بہت بُری سمت جا رہی ہے کیونکہ امریکی اسلحہ اسلامی بنیاد پرستوں کے ہاتھ لگ رہا تھا۔ اُس وقت سب سے بڑا مقصد سوویت یونین کو شکست دینا تھا۔ میک ولیمز نے کہا کہ انہیں سائیڈ لائن کر دیا گیا، اُن پر ذہنی مریض، شرابی اور ہم جنس پرست ہونے کی تہمت لگائی گئی اور تبادلہ کر دیا گیا۔ خود سی آئی اے کے تجزیہ کاروں نے ۱۹۸۷ء میں خبردار کیا تھا کہ ایک فاتح اسلامی حکومت کو ”اسلحے کا پہاڑ“ ترکے میں مل سکتا ہے اور وہ اسے کہیں اور اسلامی چھاپہ مار جنگجوؤں کو مسلح کرنے یا تربیت دینے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس انتباہ کے باوجود اسلحے کی فراہمی جاری رہی۔

یہی فتح کا غرور گھر میں یعنی مغرب کی اندرونی دنیا میں

بھی جڑ پکڑ گیا۔ مغربی معیشتوں میں دولت کی کمی نہیں تھی مگر اُنہیں سرمایہ کاری کے بجائے دولت نچوڑنے کے لیے زیادہ منظّم کیا جارہا تھا۔ ماہرِ معاشیات ماریانہ مازوکاتو (Mariana Mazzucato) نے مجھے بتایا ’’اب برطانوی مالیات کا ٨٠ فیصد حصہ واپس مالیات، انشورنس اور رئیل اسٹیٹ سیکٹر میں چلا جاتا ہے۔ مغربی معیشتیں زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے قابل تو ہوگئیں مگر خوشحالی جن پیداواری بنیادوں پر منحصر ہوتی ہے، اُنہیں بہتر بنانے میں اتنی ہی ناکام ہوتی گئیں۔‘‘

۲۰۰۷ء کے اوائل میں عالمی بینک کے ایک ایگزیکٹو ڈائریکٹر نے اپنے دوست ماہرِ معاشیات ہا جون چانگ (Ha-Joon Chang) کو بتایا کہ ایک بہت بڑا بحران آنے والا ہے۔ اس کے پاس اس کا ثبوت اس کی کلینر تھی جس کے بارے میں اُسے شک تھا کہ وہ غیرقانونی تارکِ وطن ہے۔ اس کا ۳ لاکھ ڈالر کا قرضہ تھا۔ سُست روی کی شکار اجرتوں پر سستے قرضوں کا پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ ایک ماہرِ معاشیات نے اس ماڈل کی توضیح کرتے ہوئے کہا تھا ’’اُنہیں قرضہ کھانے دو۔‘‘ اور اب وہ کاغذی پردہ پھٹنے والا تھا۔ جب ایسا ہوا، تو اس ناکام معاشی ماڈل کو اس حادثے کے ذریعے ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس، عام لوگوں کو سماجی امداد اور سہولتوں کی قربانی دے کر اِسے بچانے پر مجبور کیا گیا۔

یہ جوابی یا زوال آمیز گراوٹ جہاں لے جاسکتی ہے، وہ مقام انتہائی خوفناک ہے۔ اسرائیل کی نسل کشی نے لامحدود پستی کو معمول بنادیا ہے۔ ٹرمپ ازم نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بیانیے اور اداروں کو دوبارہ استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ ملکی سطح پر اختلافِ رائے کونشانہ بنانے کے لیے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا راگ دوبارہ الاپا جارہا ہے۔ مطلق العنانیت (Authoritarianism) اور سفا کی مکمل طور پر ہمارا ممکنہ مستقبل ہیں۔

ایک اور امکان بھی موجود ہے۔۔۔ بائیں بازو کا طبقہ ایک مختلف موقف پیش کرے۔ یہ کہ وہ مغربی حکمران طبقے کی جانب سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک دولت اور اقتدار کی لامتناہی اور بے لگام ہوس تھی جو ہمیں یہاں تک لائی اور اصل کام اس چیز کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے جسے مارگریٹ تھیچر نے تباہ کرنے کی کوشش کی تھی یعنی معاشرہ اور یہ کام اس دولت سے سرمایہ کاری کرکے کرنا ہے جسے ہم اجتماعی طور پر پیدا کرتے ہیں۔

(مترجم: ابوصباحت)

"The west is in freefall - and the worst part is that we were warned, but chose not to listen". ("The Guardian". Sep 21, 2026)

بِرکس کی کہانی

Mahesh Vaankani

دنیا ایک بار پھر بلاکس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ علاقائی بنیاد پر معرضِ وجود میں لائے جانے والے سیاسی وعسکری اتحاد عالمی سیاست ومعیشت پر گہرے اثرات مرتب کررہے ہیں۔ یہ سیاسی، معاشی اور اسٹریٹجک اتحاد مختلف النوع مقاصد کی تکمیل کے لیے ہیں۔

’’برکس‘‘ بھی ایک ایسا ہی اتحاد یا گروپ ہے۔ اس معاشی اتحاد کے ابتدائی ارکان چار تھے۔۔۔ برازیل، روس، بھارت اور چین۔ اِس بنیاد پر یہ اتحاد ابتدا میں BRIC کہلایا۔ پھر اِس میں جنوبی افریقا شامل ہوا تو اِسے BRICS کہا جانے لگا۔ اب ارکان کی تعداد ۱۱؍ ہوچکی ہے مگر نام میں مزید تبدیلی نہیں کی گئی۔ یہ اتحاد اِس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اِس کے ارکان کی آبادی عالمی آبادی کا نصف ہے اور مجموعی خام قومی پیداوار (جی ڈی پی) عالمی جی ڈی پی کا ۴۰ فیصد ہے۔

برکس کا سربراہ اجلاس حال ہی میں بھارت میں منعقد ہوا۔ اس اتحاد یا گروپ کی ابتدا ۲۰۰۱ء میں ہوئی تھی۔ اب اِس کے ارکان میں مصر، ایتھوپیا، ایران، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور انڈونیشیا بھی شامل ہیں۔ اِس اتحاد کے رکن ممالک کی مجموعی مارکیٹ اِتنی بڑی ہے کہ اگر باقی دنیا سے معاشی روابط کی پروا نہ بھی کی جائے تو آپس کی تجارت بھی بہت ہے۔

اِس اتحاد کو ابتدا میں BRIC کا نام گولڈمین سیش کے ماہرِ معاشیات جم اونیل نے دیا تھا۔

۲۰۰۹ء میں روس کے شہر یکاترنبرگ میں برکس کا پہلا سربراہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ برکس کی چھتری تلے پائی جانے والی آبادی میں سب سے بڑا حصہ چین اور بھارت کا ہے۔ انڈونیشیا، برازیل، روس، مصر، ایتھوپیا اور ایران بھی معقول درجے کی مارکیٹ ہیں۔ تجارت وصنعت کے لیے یہ ایک بہت بڑی کسٹمر بیس ہے۔ برکس گروپ اب دن بہ دن بڑا اور مضبوط ہوتا جارہا ہے۔ تجارت، توانائی، مالیاتی امور اور وسیع معاشی نظام میں اس کا کردار مسلسل بڑھ رہا ہے۔ عالمی تجارت میں اِس کا حصہ تقریباً ۲۶ فیصد ہے۔

ماہرین کے مطابق برکس کی معاشی اہمیت صرف جی ڈی پی کے اعداد وشمار تک محدود نہیں۔ برکس میں دنیا کی دو سب سے بڑی معیشتیں اور سب سے زیادہ آبادی والے ممالک چین اور بھارت شامل ہیں۔ روس، سعودی عرب، ایران اور یو اے ای جیسے توانائی کے اہم برآمدی تاجر اور برازیل اور روس جیسے اہم اشیا اور وسیع زرعی پیداوار کے حامل ممالک بھی اِس کا حصہ ہیں۔ یہ تنظیم اب وسیع تر معاشی تعاون یا اشتراکِ عمل کی طرف جارہی ہے۔ اس کے لیے رکن ممالک کے درمیان تجارت بڑھانا، مضبوط سپلائی چین بنانا، مقامی کرنسی کے استعمال کو فروغ دینا اور سرحد پار ادائیگیوں کے لیے ایسا نظام تیار کرنا جو ٹرانزیکشن اخراجات کو کم کرسکے، لازم ہوچکا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF) کی جولائی ۲۰۲۶ء میں شائع ہونے والی رپورٹ ’’ورلڈ اکنامک آؤٹ لک‘‘ کے مندرجات کے مطابق ۲۰۲۶ء میں معاشی نمو کی عالمی شرح ۳ء۳ فیصد رہنے کا امکان ہے۔ چین کی شرحِ نمو ۶ء۴ فیصد انڈونیشیا کی ۵ فیصد، برازیل کی ۴ء۲ فیصد اور روس کی شرحِ نمو ۱ء۱ فیصد رہنے کا امکان ہے۔ مینوفیکچرنگ میں چین کی صلاحیت اور استعداد کا کوئی جواب نہیں۔ وہ اس گروپ کی سب سے بڑی معیشت ہے۔ بھارت تیز تر معاشی نمو کے ساتھ ایک بڑی مقامی مارکیٹ رکھتا ہے۔ برازیل زرعی اور صنعتی پیداوار کا ایک بڑا برآمدی تاجر ہے۔ روس اور خلیجی ممالک توانائی اور خام مال کی طاقت فراہم کرتے ہیں۔

گروپ کی آبادی کو قوتِ خرید سمجھ لینا غلط ہوگا۔ برکس کے ارکان کے درمیان معاشی ناہمواری کافی بڑی ہے۔ یو اے ای اور سعودی عرب میں فی کس آمدنی زیادہ اور بڑے پیمانے پر سرمایہ دستیاب ہے جبکہ بھارت، مصر اور ایتھوپیا میں فی کس آمدنی کافی کم ہے لیکن ان کے پاس بڑی آبادی اور طویل مدتی ترقی کی امکانات ہیں۔ یہ امتزاج برکس کو ایک بڑا حجم دیتا ہے تاہم یکساں معاشی طاقت نہیں۔

برکس جس شعبے میں اپنے حجم کو عملی معاشی طاقت میں بدلنے کی کوشش کررہا ہے، وہ تجارت ہے۔ بھارتی وزارتِ تجارت نے مئی میں بتایا تھا کہ ۲۰۲۴ء میں برکس ممالک کے درمیان تجارت ۱۱۷۰؍ارب ڈالر تک پہنچ گئی جو ۲۰۰۳ء کے ۸۴؍ارب ڈالر سے ۱۳؍گنا تھی۔ یہ اضافہ اِسی عرصے کے دوران عالمی تجارت کی توسیع سے کہیں زیادہ تیز رہا ہے۔ اس کے باوجود عالمی جی ڈی پی کا ۴۰ فیصد حصہ رکھنے والے

گروپ کے رکن ممالک کے درمیان تجارت اب بھی نسبتاً کم ہے۔ اس فرق کے باعث ہی معاشی ہم آہنگی ترجیح بن گئی ہے۔

اگست ۲۰۲۶ء میں جے پور میں منعقدہ سولھویں برکس وزرائے تجارت اجلاس نے اس ایجنڈے کو آگے بڑھایا ہے۔ وزرائے تجارت نے ’’اسٹریٹجی فار برکس اکنامک پارٹنرشپ ۲۰۳۰ء‘‘ پر کام آگے بڑھایا۔ تجارت، ڈیجیٹل معیشت، صنعت، جدت اور ٹیکنالوجی، سرمایہ کاری، مالیاتی تعاون اور پائیدار ترقی کو اہم اہداف میں شامل کیا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ برکس کی حدود میں ڈالر سے نجات پانے یا اُس پر انحصار گھٹانے کی بحث نے سب سے زیادہ توجہ حاصل کی ہے۔

حقیقت سیاسی بیانات سے کہیں زیادہ محدود ہے۔ برکس ارکان فی الحال کسی مشترکہ ’’برکس کرنسی‘‘ پر بات چیت نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے بجائے اُن کی توجہ تجارت اور سرمایہ کاری کے لیے قومی کرنسیوں کا استعمال بڑھانے، ادائیگیاں بہتر بنانے اور سرحد پار لین دین کو تیز اور سستا بنانے کے لیے متبادل تلاش کرنے پر مرکوز ہے۔ ۲۰۲۴ء کے کازان اعلامیے میں مقامی کرنسیوں، پیمنٹ پلیٹ فارمز اور ’’برکس کلیئر‘‘ کے نام سے جانے جانے والے کراس بارڈر سیٹلمنٹ انفرااسٹرکچر پر کام جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا گیا تھا۔

ماہرین کا ماننا ہے کہ تجارت میں ڈالر کے کردار کو کم کرنا صرف سیاسی فیصلہ نہیں۔ عالمی مالیاتی منڈیوں، بین الاقوامی قرضوں اور اشیا کی قیمتوں کے تعین میں ڈالر گہرائی سے جُڑا ہوا ہے۔ دوطرفہ تجارت کے لیے مقامی کرنسی کا استعمال نئے خطرات پیدا کرسکتا ہے۔ برآمد کنندگان اور درآمد کنندگان کو لیکویڈیٹی، ہیجنگ کے وسائل اور کرنسی کے تبادلے کے لیے اعتبار کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برکس کرنسی کی اچانک آمد کے بجائے مقامی کرنسی میں آہستہ آہستہ منتقل ہونا زیادہ عملی بات ہے۔

کرنسی یا تجارت سے بھی بڑھ کر اس وقت یہ دیکھا جا رہا ہے کہ توانائی برکس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ توسیع شدہ برکس میں تیل پیدا کرنے والے چار بڑے ممالک روس، سعودی عرب، ایران اور یو اے ای اور دنیا کے دو سب سے بڑے توانائی کے صارفین چین اور بھارت شامل ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق برکس ارکان عالمی خام تیل کی پیداوار میں ۴۳ء۶ فیصد اور قدرتی گیس کی پیداوار میں ۳۶ فیصد حصہ رکھتے ہیں۔ کوئلے کی پیداوار میں اِس گروپ کا حصہ ۷۸ء۲ فیصد تک ہے۔ برکس انرجی کارٹل کے طور پر کام نہیں کرتا لیکن توانائی کے اہم پیداکاروں اور صارفین کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا سرمایہ کاری، انرجی سکیورٹی اور انفرااسٹرکچر میں تعاون کے بڑے مواقع پیدا کرتا ہے۔ برکس ممالک کے پاس دنیا کے تقریباً ۷۲ فیصد ریئر ارتھ (کمیاب معدنیات) کے ذخائر ہیں۔ الیکٹرک گاڑیاں، بیٹریز، قابلِ تجدید توانائی، سیمی کنڈکٹرز اور دفاعی ٹیکنالوجی کے لیے یہ وسائل ناگزیر ہیں۔ تاہم صرف معدنی ذخائر ہونا کافی نہیں۔ اِن کی پروسیسنگ اور ریفائننگ کی صلاحیت بھی اُتنی ہی اہم ہے، اِس لیے برکس کے پاس صرف خام مال بیچنے کے بجائے پروسیسنگ، مینوفیکچرنگ اور ٹیکنالوجی پارٹنرشپ کی طرف آگے بڑھنے کا موقع موجود ہے۔

ماہرین کا ماننا ہے کہ اعداد و شمار کے لحاظ سے برکس کا وزن کافی زیادہ ہے لیکن اسے اجتماعی اثر و رسوخ میں بدلنا بہت بڑا چیلنج ہے۔ برکس کے پاس کوئی مشترکہ کرنسی نہیں، کوئی کسٹمز یونین نہیں اور نہ ہی کوئی سنگل مارکیٹ ہے۔ چین اور بھارت جیسے ممالک کے درمیان وسیع تجارتی تعلقات کے باوجود اہم سیاسی اور اسٹریٹجک اختلافات بھی ہیں۔ یہ تنوع برکس کی طاقت بھی ہے اور حد بھی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ برکس کے ارکان کے لیے سب سے زیادہ مواقع تجارت، سرمایہ کاری، رابطوں اور نقل وحمل میں عملی تعاون کے حوالے سے ہیں۔

ڈیجیٹل معیشت بھی برکس کے ارکان کے لیے ایک اچھا موقع ثابت ہوسکتی ہے۔ بھارت نے اپنے DPI سسٹم (مثلاً UPI) کے تجربے کو گلوبل ساؤتھ کے ساتھ شیئر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انٹرآپریبل ڈیجیٹل سسٹمز ادائیگیوں، تجارتی دستاویزات اور مالیاتی شمولیت میں لاگت اور وقت، دونوں کو کم کرسکتے ہیں۔

برکس اپنے مالیاتی ادارے بھی قائم کر رہا ہے۔ شنگھائی میں واقع نیو ڈیولپمنٹ بینک (NDB) کی بنیاد ۲۰۱۵ء میں انفرااسٹرکچر اور پائیدار ترقی کے منصوبوں کو فنڈ دینے کے لیے رکھی گئی تھی۔ اس کا مجاز سرمایہ ۱۰۰؍ارب ڈالر ہے۔ اس کے علاوہ قلیل المیعاد ادائیگیوں کے توازن کے دباؤ کے دوران مالی امداد فراہم کرنے کے لیے ۱۰۰؍ارب ڈالر کی ہنگامی ریزرو ارینجمنٹ بھی کی گئی ہے۔

بھارتی وزیرِ خزانہ نرملا سیتارمن نے اگست ۲۰۲۶ء میں کہا تھا کہ نجی سرمایہ اکٹھا کرنے میں NDB کا کردار اہم ہے۔ اگرچہ یہ نظام IMF اور عالمی بینک سے کافی چھوٹا ہے لیکن یہ برکس کے ایجنڈے کو مضبوط ضرور بناتا ہے۔

(یہ مضمون ۱۰؍ستمبر ۲۰۲۶ء کے بھارتی اخبار ’’گجرات سماچار‘‘ کی ویب گاہ سے لیا گیا ہے۔۔۔ مترجم: ابوالحسن اجمیری)

* * *

اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی کی شائع کردہ نئی کتب

جدیدیت کے گمراہ کن افکار اور اسلام
دانیال حقیقت جو
قیمت: ۸۰۰ روپے

زندگی کے عام فقہی مسائل
(چھ جلدیں)
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
قیمت: ۳۳۰۰ روپے

پڑوسی کے حقوق
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
قیمت: ۱۰۰ روپے

دعائیں بے اثر کیوں ہوگئیں؟
رضی محمد ولی
قیمت: ۴۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5، فیڈرل ’بی‘ ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950